عشقِ مجازی سے
عشقِ حقیقی تک

اراکین سلسلہ عظیمیہ۔ یو اے ای

عشقِ مجازی سے
عشقِ حقیقی تک

ترتیب وتدوین

اراکینِ سلسلہ عظیمیہ (یو۔اے۔ای)

www.ksars.org

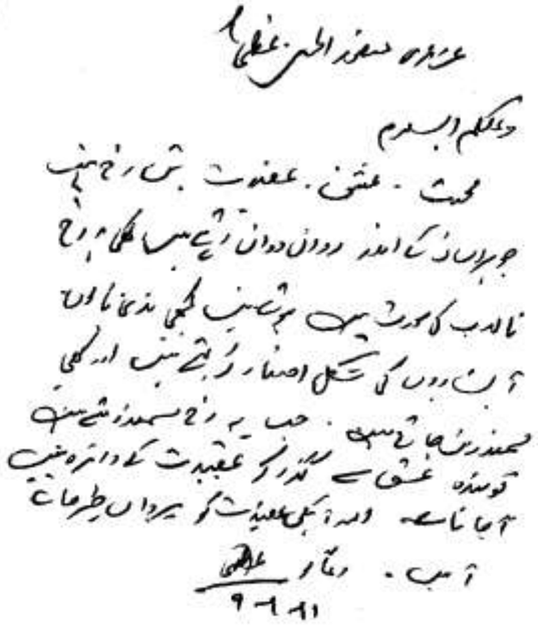

عزیزی منصور الحسن عظیمی

وعلیکم السلام

محبت، عشق، عقیدت تین رخ ہیں۔ جو ہر انسان کے اندر رواں دواں رہتے ہیں۔ کبھی یہ رخ تالاب کی صورت میں ہوتے ہیں کبھی ندی نالوں، آبشاروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی سمندر بن جاتے ہیں۔ جب یہ رخ سمندر بنتے ہیں تو بندہ عشق سے گزر کر عقیدت کے دائرہ میں آجاتا ہے۔ اللہ آپکی عقیدت کو پروان چڑھائے۔ آمین

دعا گو۔۔ عظیمی

www.ksars.org

اراکین سلسلہ عظیمیہ مراقبہ ہال عجمان۔یواے ای کی جانب سے ''ماہنامہ روحانی ڈائجسٹ''اور ''ماہنامہ قلندر شعور''میں شائع شدہ ''عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک'' کے موضوعات پر مشتمل منتخب مضامین متلاشیانِ معرفتِ عشق کے لئے پیشِ خدمت ہیں۔

اراکینِ سلسلہ عظیمیہ (یو۔اے۔ای)

www.ksars.org

فہرست مضامین

عشق..7
سیدزادہ..9
عشق کیا ہے؟..22
سمٹنا اور پھیلنا...35
دھوبن کا لڑکا..43
عشق مجازی سے عشق حقیقی تک..................................52
معرفت عشق...62
کوئل..69
حافظ پیاری..72
روشن چراغ..91
پروانہ...99
محبوب راکھ ہونے دیتا ہے اور نہ بجھنے دیتا ہے.................106
اِقبالؔ اور فلسفۂ عشق..112
فراق ـــ وصال...117
عشق اور حضوری...123
قاصد ـــ مکتبِ عشق...128
روح کی آواز...135
شہیدِ عشق...156

www.ksars.org

رقصِ ہجراں.. 171
خط—اللہ کے نام... 179
تمنائے وصلِ یار.. 186

www.ksars.org

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات، سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام، صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقین اور یقین فتحِ باب

www.ksars.org

عشق

محترم جناب عظیمی صاحب سے ایک نشست میں سوال کیا گیا کہ عشق کیا ہے—؟ جناب عظیمی صاحب نے جواب میں فرمایا—

"یہ سوال میرے ذہن میں بھی کئی دفعہ آیا۔ جب میں نے اس کے بارے میں سوچا تو بہت سارے اشعار بھی یاد آئے، بہت سارے اقوال بھی یاد آئے، بہت دن میں، میں سوچتا رہا تو میری آنکھوں کے سامنے ایک تمثال آئی—یعنی ایک تصویر آئی—اور وہ تصویر یہ تھی کہ ایک جگہ کسی تختے پر ایک موم بتی رکھی ہوئی ہے اور موم بتی میں کسی نے دیا سلائی لگائی اور روشن ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہزاروں پروانے نہ جانے کہاں سے آ گئے اور ہر پروانے کی خواہش یہ تھی کہ میں موم بتی کے شعلہ کو چھو لوں—اُس سے بغل گیر ہو جاؤں، اُس سے گلے مل لوں، وہ جاتا تھا اور جل کر گر جاتا تھا۔ میں یہ منظر بہت دیر تک دیکھتا رہا تو ذہن میں یہ بات آئی کہ—یہ عشق ہے۔

اب عشق کا اگر آپ نے راستہ اختیار کیا ہے تو اس طرح اپنے آپ کو غائب کر دو کہ، موم بتی جلنے کے بعد دھاگہ نہیں رہتا۔ موم بتی کا جسم تو رہ جاتا ہے لیکن وہ دھاگہ جو قربان ہوا ہے، اپنے محبوب پر اس طرح قربان ہو جاتا ہے کہ دھاگہ نظر نہیں آتا—بس—اگر ایسا ہو گیا تو عشق کا مقصد پورا ہوتا ہے ورنہ تو کبھی نہیں ہوتا۔

اب ہم کچھ بھی کہتے رہیں اور جلنے مرنے کا مقصد یہ لیں کہ ہم تو جل کر راکھ ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ—یہ سب کچھ نہیں ہے۔ اس کے ذہن میں اس کے سوا کچھ آتا ہی نہیں ہے کہ میں نے اس پر قربان ہونا ہے۔ یہ قربانی نہیں ہے کہ آپ اس کے پیر دبا دیں، اس کو اچھا کھانا کھلا دیں، اس کو اچھے کپڑے سلوا کر دے دیں، اس کو خوشبوئیں بہت ساری لا کر دے دیں یا جو بھی کچھ ہے—یہ کچھ بھی نہیں ہے۔

www.ksars.org

عشق یہ ہے کہ — آپ اپنی انا کو جو موم بتی کے اندر روشنی بن رہی ہے — جو اپنی نمائش کر رہی ہے کہ میں ہوں — 'میں ہوں، میں روشنی ہوں، میں روشنی ہوں' — اور پروانے آتے ہیں روشنی کے عاشق ہوتے ہیں، اُس روشنی کا طواف کرتے ہیں (دیکھئے گا کبھی) اور جوش میں آکر شعلے کی نذر ہو کر مر جاتے ہیں — اور جب وہ موم بتی جلنے کے بعد ختم ہوتی ہے تو وہاں اُس کے خون کے — موم کے چند قطرے تو ملتے ہیں — لیکن دھاگہ نہیں ملتا۔ موم جو ہے اُس کا لباس ہے اور دھاگہ جو ہے اُس کی روح ہے — بس یہ میری سمجھ میں آیا تھا''۔

خواجہ شمس الدین عظیمی

مرکزی مراقبہ ہال کراچی

www.ksars.org

KSARS

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

سیدزادہ

یہ واقعہ میں نے دسمبر ۱۹۴۹ ء میں کسی رسالے میں پڑھا تھا اور اپنے فائل میں لگایا تھا۔
۷۴ سال کے بعد اب قارئین کی خدمت میں ہے۔ (خواجہ شمس الدین عظیمی)

بات جس قدر پُرانی ہے اسی قدر دل چسپ اور عجیب ہے۔

ضلع سیالکوٹ کے مضافات میں ایک خوبصورت نوجوان سیدزادہ زمیندار تھا۔ اس کا اصلی نام تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن جن بڑے بوڑھوں کی زبانی یہ داستان ہم تک پہنچی ہے ان کا کہنا ہے کہ نوجوان اپنے ظلم وجور، تشدد و بربریت، غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کے لحاظ سے جابر کہلاتا تھا۔ وہ ایک قلعے میں اقامت گزیں تھا جہاں ہر وقت ایک مسلح دستہ اس کے حکم کا منتظر رہتا تھا۔ مال واسباب لوٹنے کے علاوہ نوجوان اور خوبصورت عورتوں کو اُٹھالانا اس کا محبوب مشغلہ بلکہ پیشہ تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی شریف بہو بیٹی کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ باراتوں پر ڈاکے اس کے معمولات میں داخل تھا۔ لیکن تمام خرابیوں کے باوجود اس میں ایک خوبی تھی کہ سوائے مزاحمت کے موقع کے وہ کسی پر تشدد نہیں کرتا تھا اور نہ آج تک اس نے کسی کو قتل کیا تھا۔ مسلح سپاہی فقط حفظ ماتقدم اور ضرورت کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ طبقۂ عورت و مرد میں سے کوئی اس کا عزیز یا رشتہ دار زندہ نہ تھا لیکن حرم میں بے شمار عورتیں تھیں۔

قلعہ کے صدر دروازے پر دو مسلح پہرہ دار موجود رہتے تھے۔ اس لئے کوئی شخص اندر نہیں جا سکتا تھا۔ اگر سرکاری ہرکارے کوئی حکم نامہ لے کر آتے یا کوئی کارندہ محاصل کی وصولی کے سلسلے میں آتا تو یہ سپاہی بندوق کا ایک فائر کر دیتے تھے جس کی آواز سُن کر کیفیتِ حال دریافت کی جاتی تھی۔ لیکن غروب آفتاب سے لے کر پو پھٹنے تک کسی قسم کی مداخلت بجا و بے جا کی مطلق اجازت نہ ہوتی تھی۔ باہر بالکل سناٹا ہوتا تھا اور قلعے کے اندر رنگ رلیاں رہتی تھیں۔

www.ksars.org

لوگ جابر کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ گئے۔ مساجد میں جلسے ہونے لگے اور اس کے پنجۂ استبداد سے خلاصی پانے کے لئے طرح طرح کی تجویزیں اور تدبیریں زیرِ غور لائی گئیں۔ لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ ایک دفعہ مشورہ کیا گیا کہ گردونواح کے دیہات مل کر جابر کا مقابلہ کریں گے مگر اس تجویز پر بھی عمل نہیں ہو سکا۔

ساتھ والے گاؤں میں ایک بیوہ رہتی تھی جس کا تمام کنبہ وبا میں مبتلا ہو کر ختم ہو چکا تھا۔ سوائے ایک نوجوان بیٹی کے جس کا نام حلیمہ تھا اس بیوہ کا کوئی قریبی نہیں تھا۔ بے چاری نے اپنے ہر عزیز کی خدمت و تیمارداری کی لیکن سب کے سب باری باری چل بسے۔ جب وہ مرنے والے اقارب کو رو دھو کر بیٹھی تو اسے اپنے اور بیٹی کے گزارے کے لئے کام کاج کی فکر ہوئی۔ بیوہ خود سینے پرونے کا کام جانتی تھی۔ لیکن حلیمہ معمولی درسی کتابوں کے علاوہ قرآن کریم بھی پڑھی ہوئی تھی۔ گاؤں والوں نے اس کی سرپرستی کا بیڑا اُٹھایا اور اسے اپنے بچوں کی معلمہ مقرر کر کے ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول دیا جس میں لڑکیاں اور چھوٹے چھوٹے لڑکے پڑھتے تھے۔ حلیمہ بڑے انہماک سے بچوں کو درس دیا کرتی تھی۔ گاؤں والے اس کی عفت و پرہیز گاری کی وجہ سے نہایت عزت کرتے تھے اور ہر چھوٹا بڑا اُسے ''استانی'' کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

حلیمہ کے حسین و جمیل چہرے سے جلالِ عفت و عصمت ٹپکتا تھا۔ بیوہ جب اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ وہ دل میں سوچتی تھی کہ اس ''لالہ رُخ'' کو کس گنوار کے پلے باندھوں گی۔ اسے دن رات یہی فکر ہلکان کر رہی تھی مگر بے چاری مجبور و بے بس تھی۔ سوچتی تھی اور سوچتی رہتی تھی۔

اسی گاؤں میں خضر صورت ایک بزرگ مولانا اشرف علی رہتے تھے۔ ان کے زہد و تقویٰ اور اطاعت و عبادت کا شہرہ دُور دُور تھا۔ یہ بزرگ بہت پائے کے متدیّن عالم اور پرہیز گار تھے۔ اور ایسے پہنچے ہوئے تھے کہ انہیں حضرت رسالت مآبؐ کے دربار کی حضوری کا شرف حاصل تھا۔ تہجد کے بعد عام طور پر استراحت کے لئے لیٹ جایا کرتے تھے۔ اس وقت شرفِ حضوری سے نوازے جاتے تھے۔

www.ksars.org

انسان کسی معاملے میں جب جسمانی اور مادی جدوجہد میں ناکام ہو جاتا ہے تو اس کی توجہ فطرتاً روحانیت کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ جب لوگ جابر کے ظلم وستم سے بہت گھبرا گئے اور ہر قسم کی قانونی دادرسی سے مایوس اور نااُمید ہو گئے تو مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بپتا سنانے لگے۔

مولانا بہت ہی رقیق القلب اور رحم دل انسان واقع ہوئے تھے۔ مظلوموں کی لرزہ خیز داستانیں سُن کر بہت روئے مگر آپ نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''نہ تو میں مفتی ہوں نہ قاضی، نہ ہی میرے پاس قانونی طاقت ہے، جس سے میں جابر کے مظالم کا واجبی انسداد کر سکوں۔ آخر آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

لوگوں نے عرض کیا:

''حضرت! آپ دعا فرمائیں کہ خدائے تعالیٰ اس ظالم کو اُٹھا لے تاکہ ہم لوگوں کو اس کے ظلم وستم سے رہائی ملے۔''

مولانا: یعنی بددعا؟

لوگ: ''ہاں، بددعا۔ اور ایسی کہ مہلک دوا سے زیادہ سریع الاثر اور پُرتاثیر ہو''

مولانا: ''دیکھو بھئی! زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ فقیر کا یہ منصب نہیں کہ خدا تعالیٰ کے کاموں میں دخل دے۔''

لوگ: تو پھر خدا تعالیٰ نے جہنم کیوں بنا رکھا ہے؟ دنیا کی عدالتوں میں مجرموں کو کیوں سزائیں ملتی ہیں؟ کبھی کبھی بے گناہ بھی اس بے رحمی سے دھر لئے جاتے ہیں کہ انسان کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔

مولانا: یہ مشیت ایزدی ہے۔ ایسی صورت میں ہمارا کوئی نہ کوئی پچھلا گناہ ہوتا ہے جس کی پاداش میں یہاں ہمیں کسی نہ کسی طرح سزا مل جاتی ہے۔

www.ksars.org

لوگ: حضرت! پھر انسان فاعلِ مختار نہیں رہتا۔ پھر تو سزا و جزا کی بشارتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان پر اتنے بے حد مظالم ڈھا رہا ہے اور اُسے سزا دینے کی کوئی تجویز کارگر نہیں ہو رہی ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا سے التجا نہ کی جائے، اس سے مدد نہ مانگی جائے۔

مولانا: خدا حاضر و ناظر ہے۔ وہ خود دیکھ رہا ہے جب چاہے گا جابر کو اُٹھا لے گا۔ ممکن ہے ابھی اس کے پاپوں کی ناؤ نہ بھری ہو۔

لوگ: لیکن ایسے کاموں کی وجہ سے ہمارا ایمان متزلزل ہو رہا ہے۔ ہم نہایت پریشان ہیں۔ جب شریعت نافذ ہوئی تھی تو فاسق و فاجر سنگسار کر دیئے جاتے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جابر کی موت کے لئے بد دُعا نہ کی جائے جب کہ اسے سنگسار نہیں کر سکتے۔ آپ ہماری عرض داشت پر کان نہیں دھرتے۔ شریفوں کی عزت خاک میں مل رہی ہے، خاندانوں کے خاندان ذلیل ہو رہے ہیں، آدمی کا کیا ہے—— بے گناہ مارا گیا تو شہید۔ لیکن عورتوں کی تذلیل بہت ہی مذموم فعل ہے۔ اس کا سدِ باب، اس کا انسداد، اس کی روک تھام نہایت ضروری ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔ کیا حرج ہے اگر خُدا سے فریاد و دعا کی جائے۔ ہم آپ کو اپنا وکیل بناتے ہیں۔ آپ ہماری طرف سے بارگاہِ خداوندی میں عرض کریں۔

مولانا اس قدر روئے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ آپ نے کچھ سوچ کر فرمایا:

”آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ میں غور کروں گا۔“

اس رات مولانا نمازِ مغربین کے درمیان وقفہ میں مصروف دُعا ہوئے اور نہایت خضوع و خشوع سے بارگاہِ رب العزت میں عرض کی۔

”یا مولا! تیری مشیت میں دخل دینا فقیر کو زیب نہیں دیتا۔ لیکن جابر کے مظالم حد سے بڑھ گئے ہیں۔ تو حاضر و ناظر ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ اس نے تیرے بندوں پر کیا کیا ظلم نہیں توڑے۔ بہتر ہے کہ تو اس کو اُٹھا لے تاکہ تیرے بندے امان پائیں، آمین ثم آمین!“

www.ksars.org

تہجد کے بعد اور نمازِ فجر سے پہلے مولانا پر ایک کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ یہ وہ ساعت تھی جب آپ حضوری سے مشرف ہوتے تھے۔ مگر آج وہ ایسی گہری نیند سوئے کہ نمازِ فجر بہ مشکل ادا کر سکے۔ دن بھر اپنی غفلت پر متاسف رہے۔ شام کو پھر وہی دعا مانگی۔ صبح پھر وہی ماجرا ہوا۔ تیسری شام دُعا کی مگر رات بھر نہیں سوئے۔ صبح دربار میں حضوری ہوئی۔ مگر مولانا نے دیکھا کہ حضور رسالت مابؐ کے چہرۂ اقدس پر نقاب پڑی ہے اور رُخ دوسری طرف ہے۔ مولانا نے ڈرتے ڈرتے عرض کی۔

''یا حضرت! میں دو دن تک اپنی غفلت پر نہایت نادم ہوتا رہا اور اب جب کہ میرے خوابیدہ نصیب بیدار ہوئے ہیں میں پھر بھی دیدارِ فیض آثار سے محروم ہوں۔ ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر نقاب ہے اس پر عبس و تولیٰ کی تجدید مستزاد ہے۔ میرے ماں باپ حضورؐ پر فدا، مجھ سے کیا قصور سرزد ہوا ہے؟''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ارشاد نہ فرمایا۔ صرف انگشتِ مبارک سے اپنی گود کی طرف اشارہ کیا۔ مولانا نے دیکھا تو ہوش و حواس مختل ہو گئے اور سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد حواس بجا کر کے اور آنکھیں مل کر دیکھا مگر نگاہیں دھوکا نہیں دے رہی تھیں۔ جو کچھ دیکھا وہی دوبارہ نظر آیا۔

ایک چھوٹا سا بچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پڑا ہوا تھا جس کا حُلیہ اور چہرہ مہرہ سب جابر سے ملتا جلتا تھا۔

مولانا نے انتہائے حیرت سے عرض کی ''یا حضرتؐ! یہ تو جابر ہے''

ارشاد ہوا، ''ہاں۔''

عرض کی ''جابر اور یہ مقام؟''

فرمایا، ''میں جانتا ہوں جابر فاسق و فاجر ہے۔ عالمِ دین کا فرض ہے کہ وہ دنیا میں بھلائی چاہے۔ تم اسے ہدایت کرتے، نیکی کی طرف بُلاتے نہ کہ اس کی ہلاکت و موت کی دُعا کرتے۔''

www.ksars.org

مولانا کے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا۔ایک تھرتھری اور کپکپی مسلسل جاری ہو گئی۔استغفار پڑھتے ہوئے اُٹھے اور تمام دن توبہ میں مصروف رہے۔

اسی دن جابر اپنے قلعے کے اندر ایک کمرے میں تخت پوش پر مسند لگائے بیٹھا ہوا تھا۔وہ جس قدر بدمعاش اور عیاش تھا اسی قدر وجیہہ وشکیل اور تنومند تھا۔اس کے اعضاء مے نوشی کے باوجود متناسب تھے اور چہرے سے ایک قسم کی جلالت مترشح تھی،اس کے قریب ہی ایک اور نوجوان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔دونوں ایک خطرناک سازش میں مشغول تھے۔

جابر:رفیق! جو کچھ تم کہتے ہو درست ہو گا لیکن سوال یہ ہے اس کو کیسے اُٹھایا جائے؟ تمام گاؤں والے اس کی عزت کرتے ہیں۔وہ اس کے لئے جان لڑا دیں گے۔اور مجھے یہ گوارا نہیں کہ کسی کی جان لوں۔میں خون نہیں کرنا چاہتا۔

رفیق:آپ مختار ہیں۔مگر حلیمہ کو آپ کے حرم میں ہونا چاہئے۔وہ نہایت ہی حسین لڑکی ہے۔میری رائے تو یہ ہے کہ دن کے وقت جب کہ لوگ کھیتی باڑی میں مصروف ہوں مدرسے پر یورش کی جائے اور حلیمہ کو اُٹھا لیا جائے۔

جابر:اگر اس ہڑبونگ میں کسی بچے کی جان ضائع ہو گئی تو اس کی ذمہ داری کس پر ہو گی؟

رفیق:بچے ہی تو ہیں،وہ ڈر کر بھاگ جائیں گے۔

جابر:پھر بھی میں یہ مناسب نہیں سمجھتا۔

رفیق:پھر آپ جانیں۔بُڑھیا چاہتی ہے کہ حلیمہ کی شادی کسی نوجوان سے کر دے۔شادی کے بعد یہ معاملہ ٹیڑھی کھیر ہو جائے گا۔میرے خیال میں تساہل نہیں کرنا چاہئے۔

جابر:ہاں! اس صورت میں معاملہ غور طلب ہے۔

رفیق:آپ سب مجھ پر چھوڑ دیں۔فقط بیس سوار میری تحویل میں دے دیں۔میں گاؤں کے پنچوں کو بلاؤں گا اور زمینداری کے حسابات کے سلسلے میں مشورہ کے لئے ان کو ایک جگہ جمع کر لوں گا اور آپ اپنا کام کر لیں۔

www.ksars.org

اس کے بعد مجلسِ سازش برخاست ہوگئی اور جابر اُٹھ کر چلا گیا۔

مولانا اشرف علی شام کی نماز کے بعد مصروفِ اوراد تھے کہ بہت سے لوگ چیختے چلاتے ہوئے آئے۔ انہوں نے فریاد کی کہ آج جابر ہمارے مدرسے کی معلمہ حلیمہ کو اُٹھا کر لے گیا ہے۔ آپ کیوں بددعا نہیں کرتے۔ یہی مدد کا وقت ہے۔''

مولانا یہ واقعہ سن کر بہت محزوں ہوئے اور کہنے لگے ''مجھے آپ لوگوں سے پوری ہمدردی ہے مگر اللہ اور اس کے رسولؐ بددعا سے منع فرماتے ہیں۔ میں جابر کی اصلاح کے لئے دعا کروں گا۔''

لوگ: اُس کی اصلاح اس وقت ہوگی جب تمام گاؤں کی عزت بگڑ جائے گی۔''

مولانا: آپ گھبرائیں نہیں، میں ابھی تدارک کروں گا۔''

لوگ: تدارک کیا ہوگا۔ تھانہ یہاں سے پانچ میل پر ہے۔''

مولانا: رپٹ وغیرہ نہ ہوگی۔ آج یا اشرف علی نہیں رہے گا یا جابر۔ چلو تم سب اپنے اپنے گھر کو لوٹ جاؤ۔ میں تن تنہا اس کے پاس جاتا ہوں۔''

لوگ: آپ ایسا نہ کریں۔ ہم بھی آپ کے ہمراہ چلتے ہیں۔

مولانا: ایسا کرنے سے ہنگامے کا خطرہ ہے۔ مفت میں جانیں ضائع ہوں گی۔

لوگ: ہمیں مرنا منظور ہے مگر اپنی عزت لٹتے نہیں دیکھ سکتے۔

مولانا: کچھ بھی ہو آپ میری واپسی کا انتظار کریں۔

لوگ واپس چلے گئے اور مولانا جابر کے قلعے کی طرف روانہ ہوگئے۔

www.ksars.org

جابر کا خاص کمرہ آج معمول سے زیادہ مہک رہا تھا۔ جس میں کافوری شمعیں جل رہی تھیں۔ ایک طرف نواری پلنگ بچھا ہوا تھا دوسری طرف فرشِ مخملیں پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں حلیمہ گٹھڑی سی بن کر پڑی رو رہی تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ ساتھ ہی جابر حلیمہ کے سر پر آموجود ہوا۔ وہ نشے میں چور تھا۔ اس نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئی شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

''استانی جی! چلو غصے کو تھوک ڈالو۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔''

حلیمہ: خاموش بدقماش ڈاکو لٹیرے۔ میں تجھ ایسے پاجی سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ اگر اپنی جان کی خیریت چاہتے ہو تو فوراً دروازہ کھول دو۔

جابر نے ایک قہقہہ لگایا اور اُٹھ کر کہنے لگا۔

''استانی جی بہت بہادر معلوم ہوتی ہیں۔ کیا مدرسے میں آپ بچوں کو پہلوانی سکھاتی ہیں؟''

حلیمہ: نالائق، منہ بند کر اور پیچھے ہٹ کر بات کر۔

جابر: شکر ہے کہ آپ بات کرنے پر تو راضی ہو گئیں۔ (پیچھے ہٹتے ہوئے) لیجئے ایک دو اور تین۔ میں پورے تین قدم ہٹ گیا ہوں۔

رونے اور سسکیاں لینے والی حلیمہ اب تنگ آ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ درودیوار کی طرف دیکھا۔ دیواروں پر جانوروں کی کھالیں، بارہ سنگھوں کے سر اور نیزے آویزاں تھے۔ مگر یہ چیزیں اتنی بلندی پر تھیں کہ حلیمہ کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہی تھی کہ جابر نے پھر مخاطب ہو کر کہا،

''کیا نیزہ بازی کا شوق ہے؟''

حلیمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

www.ksars.org

جابر: دیکھئے استانی جی! یہ قلعہ ایسی جگہ ہے جہاں رات کے وقت کوئی نہیں آسکتا اور اس کمرے میں تو چڑیا بھی نہیں پھڑک سکتی۔ آپ ناحق پریشان نہ ہوں۔ کھڑے کھڑے تھک جائیں گی۔

حلیمہ پھر خاموش رہی لیکن غصے کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلتی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

جابر: معلوم ہوتا ہے کسی کا انتظار ہے، کیا گاؤں والے تمہیں بچانے کے لئے آئیں گے۔

حلیمہ: نہیں مجھے کسی غیبی امداد کی توقع ہے۔

جابر: جابر مدرسے کا طالب علم تو نہیں جسے ایسی باتوں میں اُلجھا سکو۔

حلیمہ: آخر تم کیا چاہتے ہو، تم نے مجھے کیوں قید کر رکھا ہے؟

جابر: میں کیا چاہتا ہوں یہ تمہیں پتہ ہے۔

حلیمہ: (تنگ آکر) جابر، دیکھو، تم اپنے ناپاک ارادے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکو گے۔ میں سیدہ ہوں۔

جابر: مضائقہ نہیں۔ میں بھی سیدزادہ ہوں۔

حلیمہ: پھر تمہارے لئے اور بھی شرم کا مقام ہے کہ تم مرد ہو کر عورتوں پر دست درازیاں کرتے ہو اور اپنے جدبزرگوار کی آل کے نام پر بٹہ لگاتے ہو۔۔۔!

باہر سے بندوق کے فائر کی آواز آئی۔ جابر گھبرا گیا۔ رات کے وقت کون آسکتا ہے۔ اس نے سوچ کر کہا۔ حلیمہ تمہارے مددگار آپہنچے۔

www.ksars.org

حلیمہ: سوائے ذاتِ خدا کے میرا کوئی مددگار نہیں۔ اتنا کہہ سکتی ہوں کہ کل رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر آدھی پوری ہو چکی ہے اور آدھی پوری ہونے والی ہے۔

جابر: خواب بیان کرو۔ میں سننا چاہتا ہوں۔

حلیمہ: رات میں نے دیکھا کہ مجھے بھیڑیا اُٹھا کر لے گیا ہے۔ ایک بزرگ اچانک اُدھر سے آنکلے۔ انہوں نے مجھے اس کے چنگل سے بچالیا۔

دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔

جابر: کون ہے؟

آواز: حضور! میں ہوں آپ کا خادم۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تشریف لائے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

جابر: اس وقت؟ تم نے بتایا نہیں کہ رات کو ملاقات نہیں ہو سکتی۔

آواز: وہ فرماتے ہیں کہ اسی وقت ملنا چاہتا ہوں

انسان کتنا ہی بدقماش اور بُرا کیوں نہ ہو۔ نیک بندوں کے سامنے اُسے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ مولانا اشرف علی بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ لوگ ان کی بہت عزت و تکریم کرتے تھے۔ جابر ایسے وقت میں جب کہ وہ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا تھا، مولانا کی ملاقات کے لئے راضی ہو گیا۔ اس نے حلیمہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

''حلیمہ تیرا دوسرا آدھا خواب پورا ہو گیا۔''

اور دروازہ کھول کر حلیمہ کو دوسرے کمرے میں بھجوادیا۔ اور خود اسی حالت میں ننگے پاؤں مولانا کی پیشوائی کے لئے روانہ ہو گیا۔ تمام ملازم اور کنیزیں حیران رہ گئیں۔

www.ksars.org

مولانااور جابر دونوں اسی کمرے میں آئے جہاں پہلے حلیمہ محبوس تھی۔جابر مولانا کے جِلو میں اس طرح کھڑا تھا جیسے عدالت کے کٹہرے میں خونی مجرم۔اُس نے مولانا سے کہا،

"تشریف رکھئے۔"

مولانا:آپ بیٹھئے!میں کھڑا رہوں گا۔

جابر:میں یہ گستاخی کیوں کر کر سکتا ہوں

مولانا:جابر!آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے آپ سادات میں سے ہیں۔

جابر:آپ عالمِ دین ہیں،میں گنہگار ہوں۔

مولانا:کاش!میں آپ کی طرح گنہگار ہوتا اور مجھے بھی وہ رتبہ نصیب ہو سکتا جو آپ کو ملا ہے۔

جابر:حضرت!مجھے شرمندہ نہ کریں۔۔۔میں ایسا سیاہ کار ہوں کہ رحمت سے بھی مایوس ہوں۔

مولانا:(روتے ہوئے)اگر میں آپ کی بخشش کا ضامن بنوں تو؟

جابر:(حیران ہو کر)آپ رو رہے ہیں،میں کیسے بخشا جاؤں گا۔

مولانا:جابر!میں آپ کا گنہگار ہوں اس لئے رو رہا ہوں،اسی لئے میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔

جابر:آپ کیا فرما رہے ہیں؟

مولانا:آپ جانتے ہیں میں عالم ہوں۔

جابر:اس میں کوئی شک نہیں۔

www.ksars.org

مولانا: میں حکم دیتا ہوں کہ آپ بیٹھ جائیں۔ پھر عرض کروں گا۔

جابر پلنگ پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے اُسے کسی نے کندھوں پر زور دے کر گرادیا ہو۔ مولانا برابر کھڑے رہے اور کہنا شروع کیا۔

’’جابر! سنئے اور غور سے سنئے۔ آج سے کچھ دن قبل آپ کے جور و ستم سے تنگ آکر میرے پاس گاؤں کے لوگ آئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ میں آپ کے حق میں ہلاکت کی دعا کروں۔ میں نے ہر چند ٹالنے کی کوشش کی لیکن ان کی اندوہگیں داستانیں سن کر مجھے آپ پر غصہ آگیا۔ میں نے بددعا کی۔ دوسری صبح میں شرف حضوری سے محروم ہو گیا۔ دوسرے دن بھی اسی طرح ہوا۔ تیسری صبح کو جو کچھ میں نے دیکھا، وہ عجیب منظر تھا یعنی آپ۔۔۔۔‘‘

جابر کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’آپ نے دیکھا کہ میں کتنا گناہ گار ہوں کہ آپ جیسے عالم بھی میری ہلاکت چاہتے ہیں۔ اچھا، پھر کیا ہوا؟‘‘

مولانا نے سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا،

’’میں نے دیکھا کہ حضورؐ مجھ سے ناراض ہیں اور تعارض فرمارہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر وجہ دریافت کی تو حضورؐ نے اشارہ فرمایا۔ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں جابر ہے اور۔۔۔۔‘‘

جابر کھڑا ہو گیا اور دیوانہ وار پھرنے لگا۔ مولانا کی آنکھیں اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں گھوم رہی تھیں۔ اس نے یکایک اس زور سے چیخ ماری کہ تمام قلعہ گونج اٹھا۔ چاروں طرف سے مرد و زن سب بھاگ کر آپہنچے۔ انہوں نے دیکھا کہ جابر بے ہوش ہو کر زمین پر گر چکا تھا۔ مولانا نے اس کا سر زانو پر رکھ لیا اور لوگ گرد جمع ہو گئے۔

اس نے یکایک آنکھیں کھول دیں، چاروں طرف دیکھ کر پھر اُٹھ بیٹھا اور مولانا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا،

’’ میں اور رسول اللہ ؐکی گود ! میں اور رسول اللہ ؐکی گود ! میں اور رسول اللہ ؐکی گود !!‘‘

تین دفعہ کہا اور پھر دروازے میں کھڑے ہو کر زور سے آوازیں دینے لگا۔

www.ksars.org

’’سپاہیو! لوٹ لو قلعہ، تمام مال واسباب لے جاؤ، سبھوں کو آزاد کردو، ان کے گھروں میں انہیں پہنچادو۔‘‘

اور خود ’’میں اور رسول اللہؐ کی گود! میں اور رسول اللہؐ کی گود!۔۔ پکارتا اور چیختا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے پھر کسی نے نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں زمین کھا گئی یا آسمان نے اُٹھالیا۔

www.ksars.org

سہیل احمد

عشق کیا ہے؟

عشق کیا ہے ؟ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کی بنیاد انسان کو ایسے نقطہ میں لے آتی ہے جہاں وہ براہ راست قانون قدرت کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہو جاتا ہے۔

حَسن نے ابھی جوانی میں قدم رکھا تھا کہ ان کی والدہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد چھوٹے بہن بھائیوں کی معصوم نگاہیں بھائی پر ٹک گئیں۔ کیوں کہ وہی اب ان لوگوں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ حَسن نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی اور وہ ایک عمدہ شاعرانہ ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ بے حد حساس طبیعت کے مالک تھے۔ سنجیدگی، بردباری ،معاملہ فہمی اور غور و فکر ان کی ذات کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ حَسن نے بھائی بہنوں کی نگاہوں کو مایوس نہیں لوٹایا اور بلا تامل ان کی تمام ضروریات کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی۔ انہوں نے بہن بھائیوں کو ماں بن کر اپنی آغوش شفقت میں لے لیا اور اپنی تمام توانائیاں ان کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دیں۔ حَسن نے سلسلۂ معاش جاری رکھنے کے لئے اپنی طبیعت کی مناسبت سے مختلف رسائل و جرائد کی صحافت اور شعرا کے دیوانوں کی اصلاح و ترتیب کا کام اپنے لئے منتخب کیا۔ یوں وقت گزرتا رہا اور حَسن اپنی ذمہ داری پوری توجہ کے ساتھ پوری کرتے رہے۔

ایک دن حَسن دلی کے چاندنی چوک بازار گئے اور وہاں کسی ضرورت کے تحت ایک بقال کی دکان پر جا کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر بعد ایک پاکیزہ صورت اور معصوم شکل لڑکا اس دکان پر آیا۔ حَسن میاں نے اس لڑکے کے چہرے کو دیکھا تو نہ جانے کیا دیکھ کر دماغ کو برقی رو کی طرح جھٹکا لگا اور لمحوں میں گرد و پیش سے بے نیاز ہو گئے۔ شاید دست قدرت نے لڑکے کے چہرے کی نقاب اٹھا کر عالم ملکوت کے حُسن کا پَر تو دکھا دیا تھا۔

www.ksars.org

دن کا وقت تھا، سورج چمک رہا تھا، دنیا کی رونق اور گہما گہمی روزانہ کے مطابق تھی۔ لوگ حسب دستور اپنے اپنے خیالات میں مگن ادھر اُدھر آجا رہے تھے لیکن حَسن ہوش و خرد سے بیگانہ رام داس بقال کی دکان کے آگے کھڑے تھے۔ انہیں ایک عجیب تجربہ ہوا تھا۔ حَسن ایک نیک نام اور معزز گھرانے کے نوجوان تھے۔ ان کی مثبت اور تعمیری سوچ میں منفیت اور کج روی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ اچھا برا خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا، اس کو بیان کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

رام داس بقال نے جب یہ دیکھا کہ ایک نوجوان اس کی دکان کے سامنے محو اور مستغرق کھڑا ہے تو فوراً اٹھا اور نہایت احترام کے ساتھ کہا، کیا ہی اچھا ہو اگر آپ میری دکان پر تشریف رکھیں۔ حَسن اس درجہ محو تھے کہ بیرونی دنیا سے ان کا رابطہ وقتی طور پر منقطع ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر رام داس نے ان کا ہاتھ تھام کر دکان پر بٹھا دیا۔ کافی دیر تک وہ گم سم بیٹھے رہے اور جب حواس میں جان آئی تو اٹھ کر گھر کی طرف چل دیئے۔ گھر پہنچ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بھائی بہن جمع ہو کر باتیں کرنے لگے۔ کسی کو کچھ کہنے کی جلدی تھی اور کوئی کچھ بتانا چاہتا تھا۔ لیکن حَسن کی ذہنی غیر حاضری نمایاں تھی۔ بھائی کو کسی سوچ میں غرق پایا تو ان سب نے خیال کیا کہ شاید کام کی زیادتی سے ذہن تھک گیا ہے۔ چنانچہ وہ الگ ہٹ گئے۔ حَسن کے آگے کھانا رکھا گیا لیکن ان کو احساس ہی نہیں ہوا۔ توجہ دلانے پر تھوڑا سا کھا لیا۔

اگلے دن سے حَسن روزانہ رام داس بقال کی دکان پر جانے لگے۔ وہاں جا کر بیٹھ جاتے اور راستے پر اس طرح سے نظریں جما دیتے جیسے کسی کو تلاش کر رہے ہوں۔ ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے۔ ایک دن ان کی نگاہیں ٹھہر گئیں۔ وہی پاکیزہ اور معصوم صورت سامنے تھی جس کے دیدار کے بعد وہ ایک نئے احساس سے دوچار ہوئے تھے۔ اس چہرے کو دوبارہ سامنے دیکھ کر دل سے ایک آہ نکلی اور رگ وپے میں گداز سرایت کر گیا۔ وہ لڑکا دکان کے سامنے سے گزر کر کچھ دور ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ حَسن کو پتہ چلا کہ وہ اسی دکان پر کام کرتا ہے چنانچہ وہ اکثر اسے وہاں دیکھتے اور طلبِ دیدار کو پورا کرتے۔

www.ksars.org

حسن ایک دن رام داس بقال کی دکان پر بیٹھے تھے اور نگاہیں اس دکان پر مرکوز تھیں جہاں ان کا منظور نظر کام کرتا تھا۔ کئی دنوں سے اس کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ پہلے تو وہ اکثر نظر آجاتا تھا جس سے ان کے بے چین دل کو قرار آجاتا تھا لیکن ادھر کئی دنوں سے شوقِ دیدار کی آگ بدستور فروزاں تھی۔ مضطرب ہو کر رام داس سے پوچھ بیٹھے۔ ''کئی دنوں سے وہ لڑکا نظر نہیں پڑتا جو سامنے والی دکان پر کام کرتا ہے؟''

رام داس نے بتایا، ابھی کچھ دیر پہلے اطلاع ملی ہے کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے، بے چارہ! موت کے بے رحم ہاتھوں نے چھوٹی سی عمر میں آن دبوچا۔

یہ سننا تھا کہ حسن کا دماغ سُن ہو گیا۔ اس غیر متوقع خبر نے ان کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں ختم کر کے رکھ دیں۔ چند لمحوں کے لئے یہ فراموش کر بیٹھے کہ وہ کہاں ہیں۔ غیر اختیاری طور پر اٹھ کر چل دیئے۔ وہ خالی ذہن کے ساتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ ان کے قدم مرگھٹ جا کر رُکے۔ نگاہیں ارتھی کی راکھ پر مرکوز تھیں جس کے اندر وہ چہرہ موجود تھا جس کو وہ ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔ آج دستِ قدرت کا وہ شاہکار راکھ کا ایک ڈھیر تھا۔ موت نے ایک فصیل کھینچ دی تھی۔ انہوں نے خود سے جواب طلب کیا، آج کیا وجہ ہے کہ میں اس چہرہ کو دیکھنے کا طلب گار نہیں؟ اندر سے جواب ملا، تو جسمِ فانی کا پجاری نہیں بلکہ اُس حُسنِ لازوال کا پرستار ہے جس نے جسم پر سے اپنا سایہ ہٹا لیا ہے۔

آواز کا سننا تھا کہ بند ٹوٹ گیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ دعائیہ کلمات پڑھے اور تھکے قدموں اور بجھے دل سے گھر روانہ ہو گئے۔ اس حادثہ نے حسن کے دل و دماغ کو حد درجہ متاثر کر دیا تھا۔ گزرتا ہوا وقت بھی اس کے اثرات کو نہ مٹا سکا۔ ان پر بار بار گہری سوچ کا غلبہ ہو جاتا۔ دوست، احباب اور رشتہ دار حیران تھے کہ یہ ہنستا مسکراتا چہرہ یاس و حسرت کی تصویر کیوں بن گیا۔

جب کسی طرح دل کو چین نہیں آیا تو حسن نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ ان ہی دنوں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور جنگ کے شعلے بڑھتے ہی چلے گئے۔ ایک دوسرے پر برتری دکھانے کی خواہش بے تحاشا انسانی جانوں کے ضائع ہونے کا باعث بن رہی تھی۔ ملک گیری کی ہوس میں انسان انسان کو ہلاک کر کے خوش ہو رہا تھا۔ محض جغرافیائی تقسیم اور نظریاتی

www.ksars.org

اختلاف کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے سینے چھلنی کر رہے تھے۔ حسن برما کے محاذ پر متعین ہوئے۔ لڑائی کے دوران ایک بم ان کے قریب پھٹا اور اس کے ٹکڑے جسم میں پیوست ہو گئے۔ وہ سخت زخمی حالت میں ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے۔ لیکن علالت کے سلسلے نے طول پکڑا اور بالآخر فوج کی ملازمت کو خیر باد کہنا پڑا۔

جسمانی قوت میں کمی کی وجہ سے بخار نے آلیا۔ مسلسل بیماریوں نے حسن کی نقاہت میں بے حد اضافہ کر دیا تھا اور وہ اپنے گھر میں بستر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک دن کسی کام کے لئے بستر سے اٹھے لیکن چند قدم چل کر یکایک غشی آگئی۔ توازن کھو بیٹھے اور قریب رکھی ہوئی میز سے ٹکرائے۔ میز الٹ گئی و اس پر رکھا ہو گلاس بھی فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ساتھ ہی حسن بھی فرش پر گرے اور ہاتھ کانچ کے ٹکڑے پر پڑا، ہاتھ میں گہرا زخم پڑ گیا۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔ حواس مجتمع ہوئے تو حسن نے دیکھا کہ زخمی ہاتھ سے خون ٹپک رہا ہے۔ پلنگ کا کونا پکڑ کر اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو ایک لڑکی دروازے پر کھڑی تھی۔ دوپٹے کے پیچھے سے اس کا چہرہ چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی گہری غلافی آنکھیں حسن پر مرکوز تھیں۔ اس کے جسم پر شاخِ گل کا گمان ہو رہا تھا۔ حسن کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور مبہوت ہو کر وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ لڑکی نے حسن کے ہاتھ سے خون بہتے دیکھا تو اس کا چہرہ بجھ گیا۔

"آپ کا ہاتھ زخمی ہو گیا ہے!"

حسن کی نظریں دوبارہ لڑکی کی طرف اٹھیں۔ اس کے چہرے پر حوروں کا تقدس اور مریم کی معصومیت تھی اور اس کی نگاہیں اب بھی زخم پر لگی ہوئی تھیں۔

"زخم کا کچھ کیجئے نا، کتنا خون بہہ رہا ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" حسن نے مختصر جواب دیا۔

"میں نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی تو یہاں آگئی کہ خدانخواستہ کیا بات ہو گئی ہے"۔ لڑکی نے سر جھکا کر کہا۔

www.ksars.org

یہ لڑکی کوثر تھی جو حَسن کے پڑوس میں نئی نئی آئی تھی اور حَسن کی بہن سے اس کی گہری دوستی تھی۔ کوثر نے پانی میں بھیگی ہوئی پٹی باندھی اور جس تیز رفتاری سے آئی تھی اسی تیز رفتاری سے واپس چلی گئی۔

کوثر کے چلے جانے کے بعد حَسن اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ لیکن بار بار کی کوشش کے باوجود خیالات کا طوفان تھم نہ سکا۔ ان کا ذہن بار بار کوثر کی طرف چلا جاتا تھا۔ کوثر جس تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی اسی تیزی سے ان کے خیالات میں جگہ بنا چکی تھی۔ دروازہ کھلنا، اندر داخل ہونا، اسکا بے مثال حُسن اور ہاتھ کے زخم کو دیکھ کر بے ساختہ چہرے پر تکلیف کے نقوش نمودار ہونا یہ سب مناظر حَسن کے ذہن پر نقش ہو چکے تھے۔ وہ جتنا ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے وہ اتنی ہی شدت سے حملہ آور ہوتے تھے۔ پانی کی پُر سکون سطح پر جب کوئی چیز گرتی ہے تو ہلچل برپا ہو جاتی ہے۔ پانی میں ایک طوفان سا آجاتا ہے۔ اور یہ تبدیلی لہروں کی شکل میں سطح پر نمودار ہوتی ہے۔ کوثر نے بھی حَسن کے خیالات و احساسات کے دریا میں تموج پیدا کر دیا تھا۔

بہن نے بھائی کو ایک کاپی اٹھا کر دی۔ کاپی میں ایک طرف کوثر کے کہے ہوئے اشعار اور دوسری طرف منتخب اشعار لکھے ہوئے تھے۔ کاپی کے رکھ رکھاؤ اور طرز تحریر سے نفاست اور پاکیزگی جھلک رہی تھی۔ حَسن نے اشعار پڑھے اور جہاں مناسب سمجھا اصلاح کی۔ شعروں کا انتخاب بھی خیالات کی بلندی اور عظمت کی عکاسی کر رہا تھا۔

دن گزرتے رہے، حَسن اور کوثر کے درمیان اجنبیت کی دیواریں گرتی رہیں۔ یوں تو حَسن نے کوثر کو پہلے دن ہی اپنے لئے اجنبی نہیں پایا تھا۔ زمین کی کوکھ میں جب بیج ڈالا جاتا ہے تو وہ کئی دنوں تک زمین کے اندر مختلف مراحل طے کر کے کونپل کی شکل میں زمین سے سر باہر نکالتا ہے۔ اسی طرح حَسن کے دل میں عشق کا بیج پرورش پا کر کونپل بن چکا تھا اور اس کی جڑیں دل کے اندر پھیل رہی تھیں۔

کوثر حَسن کے لئے خوشبو تھی، روشنی تھی۔ جب وہ آتی تو اس کے وجود کی مسحور کن خوشبو پورے ماحول کو مہکا دیتی اور اس کے سراپا میں بند روشنی جب منعکس ہوتی تو در و دیوار روشن ہو جاتے، کوثر نے شمع بن کر دل کے نہاں خانے کو روشن کر دیا تھا۔ حَسن اپنے دل کو ٹٹولتے تو اس کو کوثر کے لئے ایک ناقابلِ بیان جذبہ سے سرشار پاتے تھے۔

www.ksars.org

نہ چاہنے کے باوجود کبھی کبھی وہ بے ساختہ اپنی پسندیدگی کا اظہار کر بیٹھتے تھے۔ حال دل بالواسطہ الفاظ میں زبان پر آجاتا تھا۔ ایک دفعہ کوثر کی کاپی میں انھوں نے ایک عبارت لکھی دیکھی جس میں کوثر نے فطرت کے حُسن کی تعریف کی تھی۔ لکھا تھا——

صبح کا سہانا پن، شام کا سنہرا رنگ، شفق کی سُرخی، حدِ نظر تک پھیلا ہوا آسمان، بل کھاتے دریا، گنگناتی ندیاں، موسیقی سے بھرپور جھرنے، سبزے اور درختوں سے ڈھکی ہوئی وادیاں، پرندوں کے اڑتے ہوئے غول۔ فطرت کے یہ نظارے کتنے رُوح پرور ہیں۔ انہیں دیکھ کر دل بے اختیار گداز سے لبریز ہو جاتا ہے۔

حَسن نے یہ بیان پڑھا تو انہیں کوثر کے چہرے پر فطرت کے سارے رنگ مجتمع نظر آئے۔

عشق صادق کا معاملہ آکاس بیل کا سا ہے۔ آکاس بیل کسی درخت میں پیدا ہو کر اس کے وجود پر اس طرح پھیل جاتی ہے کہ درخت چھپ جاتا ہے۔ درخت کی ساری توانائی آکاس بیل کے لئے وقف ہو جاتی ہے، اسی طرح عشق کی بیل سچے عاشق کے وجود پر چھا جاتی ہے تو عشق اور اس کی صفات باقی رہتی ہیں۔ عاشق کی ہستی فنا ہو کر عشق میں گُھل مل جاتی ہے، تحلیل ہو جاتی ہے۔ عاشقِ صادق کے دل کی سرزمین سے بھی عشق کا بیج پھوٹ کر پروان چڑھا اور اس میں نہایت تیزی سے شگوفے اور پتے پھوٹ نکلے۔ جیسے جیسے اس ننھے سے پودے نے تناور درخت بننے کے مراحل طے کئے۔ حَسن کا وجود اس کی شاخوں اور پتوں میں لپٹتا گیا، یہاں تک کہ چھُپ گیا۔

حَسن کو احساس ہوا کہ کوثر اس کی رُوح کا حصہ بن چکی ہے۔ رات ہو یا دن کسی وقت بھی اس کا خیال ذہن سے جُدا نہیں ہوتا۔ کوثر کا خیال مقناطیس کی طرح ذہن کی سوئی کا رُخ اپنی طرف رکھتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، کام کرتے، چلتے پھرتے اس کا طواف کرتا ہے۔ سپنوں کے عالم میں بھی وہ دونوں جدا نہ رہے۔ حَسن خواب میں دیکھتے——ہر طرف ہُو کا عالم ہے اور وہ کوثر کا ہاتھ تھامے کائنات کی وسعتوں میں پرواز کر رہے ہیں۔ سفید لباس میں ملبوس کوثر کے چہرے پر ملکوتی حُسن اور نور ہے اور اس کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں سے اپنائیت کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ کبھی حَسن دیکھتے کہ وہ کوثر کے ساتھ ایک گھوڑے پر سوار ہیں اور یہ گھوڑا اپنے لمبے لمبے سفید پروں کی مدد سے آسمانوں میں پرواز کر رہا ہے۔ فضا میں رنگ اور روشنیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان کے پیروں تلے ستارے موتی کی طرح چمک رہے ہیں۔ وہ کوثر کی طرف دیکھتے تو اس کا

www.ksars.org

چہرہ ستاروں کی روشنی اور فضا کی نورانیت سے زیادہ روشن نظر آتا۔ چاند ستارے اور پورا گردوپیش ان دونوں کو دیکھ کر ہنستا، مسکراتا۔ شیریں اور مسحور کن خوابوں کا یہ سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔

ایک دفعہ وہ دونوں مرغزاروں میں ٹہلتے ٹہلتے دور تک نکل گئے۔ فضا میں ہلکی ہلکی روشنی اور سبزہ کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی اور معطر ہوا کے جھونکے خوب صورت اور رنگ برنگ پھولوں کو جھولا جھلا رہے تھے۔ خوب صورت پرندے چہک چہک کر فضا میں ترنم بکھیر رہے تھے۔ قریب ہی کسی جھرنے کے گرنے کی آواز سے فضا کی موسیقیت مزید بڑھ گئی تھی۔

حَسن کبھی خوب صورت ماحول کو دیکھتے اور کبھی کوثر کے چہرے پر نظریں جمادیتے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ فطرت کی تمام رنگینیاں کوثر کے حُسن سے آباد ہیں۔ پھولوں نے اس کے لبوں کی سُرخی چرالی ہے۔ فضا کی خوش گواری اس کی سیاہ زلفوں کی مرہونِ منت ہے۔ خوش الحان طیور کے نغمے اس کی آواز کی کھنک کی بدولت زندہ ہیں۔ حَسن نے کہا،

کوثر تمہیں یاد ہے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ فطرت کا حُسن تمہارے دم سے قائم ہے، کیا میں نے غلط کہا تھا،؟ دیکھو، ان نظاروں میں تمہارے وجود سے روشنی ہے۔ یہ تمہارے حُسن سے زندگی پا رہے ہیں۔ اگر تم نہ ہو تو یہ سب ماند پڑ جائیں۔

کوثر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حَسن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا،

کوثر! تمہارے وجود کا احساس میرے اندر اس طرح پیوست ہے کہ جیسے پھول میں خوشبو، شہد میں مٹھاس اور سورج میں روشنی۔ کیا پھول میں سے خوشبو ختم ہو سکتی ہے؟ کیا شہد سے مٹھاس کو چھینا جاسکتا ہے؟ کیا سورج کے ہوتے ہوئے اس کی روشنی فنا کی جاسکتی ہے؟

حَسن کے جذبات الفاظ بن کر چشمے کی طرح اُبل رہے تھے۔ ایک ایک لفظ پاکیزہ چاہت اور عقیدت میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بولتے رہے اور یہ منظر دھندلا ہو کر ختم ہو گیا۔ پھر ذہن کی اسکرین پر دوسرا منظر اُبھر آیا،

خوب صورت لباس میں ملبوس کوثر ایک چبوترے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ حُسن کی دیوی کا مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔ حَسن اس کے قدموں میں پہنچ کر جُھک گئے۔ کوثر کی گہری آنکھوں میں ہزاروں دیپ جل اٹھے اور اس کے لبوں پر تبسم رقصاں ہو گیا۔ اس لئے کہ خلوص و محبت کا نذرانہ قبول کر لیا گیا تھا۔ فضا میں مدھر گھنٹیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

کہتے ہیں عشق اور مشک کی خوش بُو چھپی نہیں رہتی۔ چنانچہ حَسن اور کوثر کی ذہنی اور جذباتی وابستگی لوگوں کی زبانوں پر آنے لگی۔ حَسن نے جب لوگوں کی باتیں سنیں تو ان کا دل چاہا کہ وہ لوگوں سے کہیں کہ وہ ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں

www.ksars.org

،ان کی نگاہوں کو پرکھیں،ان کے دل میں طوفان خیز سمندر دیکھیں لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ لوگ رشتوں، ناطوں اور تعلقات کو ذاتی خواہشات کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں، جو خامیاں ان کے اندر ہوتی ہیں وہ دوسروں کے اندر تلاش کرتے ہیں، جو کچھ ان کے اندر رہوتا ہے وہ اس کا عکس دوسروں کی ذات میں دیکھتے ہیں۔

ایک دن حَسن پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ کوثر کے گھر والے خاموشی سے کسی اور گھر میں منتقل ہو گئے ہیں اس لئے کہ جب لوگوں کی سرگوشیاں ان کے کانوں میں پہنچیں تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔اب نہ تو کوثر کی موہنی صورت کا دیدار ہو سکتا ہے اور نہ اس کی میٹھی میٹھی باتوں کا سکون۔

دوری اور فاصلے عشق کی آگ کو اور زیادہ بھڑکا دیتے ہیں۔دوری جتنی بڑھتی ہے، کشش اور انہماک میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔کوثر سے دوری عشق کی بھٹی کے لئے ایندھن ثابت ہوئی۔شاید عشق میں جو کمی باقی رہ گئی تھی وہ جُدائی نے پوری کردی۔اس دور میں حَسن عجیب واردات و کیفیات سے گزرے۔کوثر سے ذہنی ربط اور پھر جدائی نے ان کے دل کو سوز و گداز سے معمور کر دیا۔اندر جو آگ بھڑک رہی تھی وہ کبھی آنسوؤں کی صورت میں ظاہر ہوتی اور کبھی اشعار کا روپ دھار لیتی۔ایک دن کہیں سے کسی گیت کی آواز آئی۔گیت کے الفاظ میں بلا کا درد تھا۔اور اس میں فراق کی کیفیات کو بیان کیا گیا تھا۔گیت سن کر حَسن پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔آنکھوں کے سوتے بہہ نکلے اور دل سوز و گداز کی لہروں سے کانپنے لگا۔

انہیں محسوس ہوتا کہ گھر کے در و دیوار اور خود ان کی نگاہیں کوثر کے دیدار کی متلاشی ہیں۔وہ گھر کے ان حصوں کو دیکھتے جہاں کوثر کے قدم پڑ چکے تھے۔انہیں احساس ہوتا کہ کوثر کے وجود کا نقش اب بھی ان جگہوں پر زندہ موجود ہے۔کہیں کھٹکا ہوتا تو ان کی نگاہیں آواز کی طرف بے اختیار اٹھ جاتیں جیسے کوثر آموجود ہوئی ہو۔چلتے پھرتے انہیں ایسا لگتا جیسے کوثر ان کے ساتھ سائے کی طرح چل رہی ہے۔ایک دن وہ کسی کام میں مصروف تھے کہ انہیں محسوس ہوا کہ کوثر ان کے برابر میں آکر بیٹھ گئی ہے۔وہ چونک پڑے لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ایک دفعہ اس کرسی کو دیکھ رہے تھے جس پر کوثر آکے بیٹھی تھی۔دفعتاً انہوں نے دیکھا کہ کرسی پر کوثر بیٹھی ہے۔اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہاں کوئی نہ تھا۔حَسن کے پاس

www.ksars.org

کوثر کی نشانی ایک قلم اور ایک کتاب تھی جو کوثر نے انہیں تحفہ میں دی تھی۔ یہ انہیں کتنی عزیز تھیں اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہے۔ حَسن قلم اور کتاب کو ہاتھ لگاتے تو انہیں ان چیزوں پر کوثر کی انگلیوں کا لمس محسوس ہوتا۔

ایک رات حَسن نے کھڑکی کھولی تو چودھویں کا چاند پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ چاند کو دیکھا تو کوثر کا خیال ذہن کی سطح پر نمودار ہوا۔ کوثر جو چاند سے زیادہ خوب صورت اور فرحت بخش تھی۔ حَسن خیالات کے تانوں بانوں میں الجھ گئے۔ ہو سکتا ہے کہ کوثر بھی چاند کو دیکھ رہی ہو کیوں کہ اسے فطرت کے نظاروں سے بے حد لگاؤ ہے۔ انہوں نے سوچا اور پھر سوچتے سوچتے کوثر کے خیال میں ڈوب گئے۔ یکایک چاند کی روشن ٹکیہ پر کوثر کا روئے تاباں ابھر آیا۔ کوثر کے حسین چہرے کے گرد روشنی کا ہالہ بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا اور نظریں حَسن کی طرف متوجہ تھیں۔ حَسن کئی منٹ تک مشاہدے میں ڈوبے رہے۔ دفعتاً ایک تیز آواز نے انہیں چونکا دیا اور وہ منظر ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

ایک دفعہ حَسن کو کسی تقریب میں شرکت کی دعوت ملی، یہ ایک ایسی تقریب تھی جس میں ان کا موجود ہونا ضروری تھا۔ وہاں پہنچے اور تقریب کے انتظامات میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ان کا گزر مہمان خواتین کے کمرے کے پاس سے ہوا۔ اندر نظر پڑی تو مبہوت ہو گئے۔ ان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ سامنے کوثر بیٹھی تھی۔ وہی معصومانہ چہرہ، وہی نازک سراپا، جس کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئی تھیں۔ کوثر پوری محفل میں چاند کی طرح تھی جس کی روشنی کے آگے ستاروں کا حُسن ماند پڑ جاتا ہے۔ حُسن کو سامنے پا کر عشق بے خود ہو گیا۔ آج وہ حُسن کی بارگاہ میں سر جھکا کر اپنی کامل سپردگی کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ اپنے تمام تر عجز کو حُسن کے قدموں میں نچھاور کر دینا چاہتا تھا۔

کوثر کو دیکھ کر حَسن کے دل کی آگ اتنے زور سے بھڑکی کہ وہ خود کو فراموش کر بیٹھے اور اسی عالم میں کمرے میں داخل ہو کر بے اختیار کوثر کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ چند لمحوں کے لئے پوری محفل پر سکوت چھا گیا اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا، حَسن نے کوثر کے سینڈل کو چوما، سر پر رکھا اور اس محفل سے چلے آئے۔

www.ksars.org

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی اور پورے ہندوستان پر قتل و غارت گری کے سائے منڈلانے لگے۔ فسادات پھوٹ پڑے، دھرتی انسانی لہو سے سُرخ ہوگئی۔ وحشیانہ قتل میں عورتوں اور بچوں تک کو نہیں چھوڑا گیا۔ حسن اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان چلے آئے۔

فسادات کی ہولناکیاں اور زمانے کے نشیب وفراز بھی حسن کے دل سے کوثر کی یاد کو نہ مٹا سکے۔ کوثر اب بھی زندگی کا سرمایہ تھی اور اس کا تصور ان کے جسم و جان پر مسلط تھا۔

رفتہ رفتہ حسن کے اندر ایک عجیب تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ وہ بار بار خودی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے تھے اور اس طرح گم سُم ہو جاتے کہ کسی طرح بھی ان کا انہماک ـــــ نہیں ٹوٹتا تھا۔ بے خودی کے بعد وہ خود بخود ہوش کی طرف مائل ہو جاتے لیکن اس دوران ان کی حالت پورے طور پر معمول پر نہیں آتی۔ گفتگو بھی بے ربط کرتے تھے۔ جذب کی یہ کیفیت حسن پر کئی کئی گھنٹے طاری رہتی تھی۔ پھر حسن کی شخصیت میں ایک حیرت انگیز انقلاب برپا ہوا کہ وہ جو کچھ کہہ دیتے وہ پورا ہو جاتا تھا۔ اب وہ لوگوں میں ایک صاحبِ کرامت بزرگ کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ اسی زمانے میں ایک صاحب حسن کی خدمت میں آئے۔ حسن پر جذب کی کیفیت طاری تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد حسن نیم ہوش میں آئے تو اس شخص نے کہا ـــــ میں آپ کے پاس جس مقصد سے حاضر ہوا ہوں اس کے لئے آپ کے ماضی کا سہارا لینا ضروری ہے۔ میں آپ کے ماضی میں سے کوثر کے نام کو سامنے لانا چاہتا ہوں جس کا آپ کی زندگی میں شاید کوئی بڑا مقام رہ چکا ہے۔

وہ صاحب رُک کر حسن کی طرف دیکھنے لگے لیکن حسن خاموش بیٹھے انہیں مخمور نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان صاحب نے سلسلۂ کلام دوبارہ جاری کرتے ہوئے کہا، میں کوثر کا شوہر ہوں۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے میں نے ہمیشہ کوثر کو بے اطمینان دیکھا، کوئی بات ایسی ضرور تھی جو خلش بن کر اُسے بے چین رکھتی تھی پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی یہ حالت کم ہونے کے بجائے ترقی کرتی رہی، اب حال یہ ہے کہ وہ تقریباً ہوش و حواس گم کر چکی ہے اور اس کی زبان پر صرف آپ کا نام ہے۔ وہ آپ کو ایک نظر دیکھ لے تو ٹھیک ہو جائے گی، اس کے اندر جو آگ جل رہی ہے اس کی تپش سرد پڑ جائے گی۔

www.ksars.org

مہینوں بھٹکتا رہا ہوں، پھر بڑی مشکلوں سے آپ کا پتہ معلوم کیا ہے۔ خدارا میرے حال پر رحم کیجئے، مجھ پر نہیں تو اس کے معصوم بچوں کے حال پر ترس کھا کر میرے ساتھ چلئے یا پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں کوثر کو آپ کے قدموں میں لا ڈالوں ۔

حسن پر سرشاری طاری ہو گئی اور انہوں نے ہاتھ جھٹک کر کہا،

نہیں، ہم تیرے ساتھ نہیں جائیں گے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اس کے قاتل کہلائیں۔ اب ہم وہ نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ اب ہمارے دل پر کسی کی محبت غالب آ جائے تو اس کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

یہ کہہ کر حسن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، آسمان کی طرف دیکھا اور کہا——

''اے خدا! میرے اوپر رحم فرما۔''

ایک صاحب جو اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں، انہوں نے قلندر بابا اولیاء سے جب اس واقعہ کی علمی توجیہہ دریافت کی تو قلندر بابا اولیاء نے فرمایا،

کیا آپ نے حضرت ابراہیم ادھم کی سیرت کا مطالعہ نہیں کیا؟ حضرت ابراہیم ادھم ایک عرصے بعد اپنے بیٹے کو سامنے دیکھتے ہیں۔ بیٹا لڑکپن کی حدود عبور کر کے جوانی میں قدم رکھ چکا ہے۔ جوان بیٹے کو سامنے پا کر یکایک ان کے دل میں بیٹے کی محبت غالب آ جاتی ہے اور وہ دوڑ کر اسے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ اسی وقت ندائے غیبی آتی ہے:

ابراہیم! دعوائے دوستی تو ہم سے اور یہ کیا؟

حضرت ابراہیمؒ کانپ جاتے ہیں، چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ اللہ سے فریاد کرتے ہیں:

اے اللہ! میری مدد فرما۔ اے اللہ! میری مدد فرما۔

بیٹا جھرجھری لیتا ہے اور دوسرے ہی لمحہ بے جان ہو کر زمین پر گر جاتا ہے۔ لوگ آگے بڑھ کر دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی رُوح پرواز کر چکی ہے۔

www.ksars.org

"بے شک ! اللہ کی سنت میں تبدیلی ہوتی ہے اور نہ تعطل واقع ہوتا ہے۔"

غیبی دنیا میں سفر کرنے والے اکثر و بیشتر سالکین کے حالاتِ زندگی کو کھنگالا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے عشقِ مجازی سے گزر کر عشقِ حقیقی کی منزل میں قدم رکھا۔اس کی کیا وجہ ہے؟

باباصاحب نے فرمایا:

عرفانِ نفس حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے اندر ذوقِ طبیعت اور عشق موجود ہو۔ عشق کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کی بنیاد انسان کو ایسے نقطہ پر لے آتی ہے جہاں وہ براہِ راست قانونِ قدرت کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہو جاتا ہے۔ قانونِ قدرت کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کی افتادِ طبع ایسی ہو کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار کے تحت ذہنی یکسوئی حاصل کر سکے۔ ذہنی یکسوئی حاصل کرنے کا ایک موئثر راستہ کسی کے ساتھ ذہنی وابستگی ہے۔ جب یہ ذہنی وابستگی کسی انسان کے ساتھ ہوتی ہے تو یہ عشق مجازی کا رُوپ دھار لیتی ہے اور جب یہ ذہنی مرکزیت خالقِ کائنات کے ساتھ ہم رشتہ ہو جاتی ہے تو اس کا نام عشقِ حقیقی ہے۔ تاریخ کے اوراق پلٹنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ عشقِ مجازی عشقِ حقیقی کے لئے پہلا قدم ثابت ہوتا ہے۔

عشقِ مجازی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ آدمی کے تمام ذہنی رشتے اپنے ہم جنس کے ساتھ استوار ہو جائیں۔ سرمدؒ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس کے برخلاف عشقِ مجازی کی دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی بندہ صنفِ نازک کی زلف کا اسیر ہو جائے اور شمع کے لئے پروانہ بن جائے۔ صنفِ نازک کے ساتھ ذہنی وابستگی آدمی کو اس حد تک خود فراموش کر دیتی ہے کہ وہ غیر اختیاری طور پر اپنی نفی کر دیتا ہے۔ ہم جنس کے ساتھ ذہنی وابستگی رکھنے والا کوئی شخص جب عشقِ حقیقی میں قدم رکھتا ہے تو عام طور سے مجذوب ہو جاتا ہے اور صنفِ نازک سے عشق کرنے والا کوئی بندہ اگر ہوس اور جنسی جذبات کے دھاروں میں خود کو نہ بہنے دے تو اس کی شعوری صلاحیتیں سہ چند ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ صنفِ نازک کے اندر اللہ تعالیٰ کے انوار کی دو لہریں ہمہ وقت اور ہر آن جاری و ساری ہیں جب کہ مرد کے اندر ایک لہر کام کرتی ہے۔

محبوبہ کے پیر چومنے اور جوتے سر پر رکھنے کے بارے میں ارشاد کیا:

www.ksars.org

مشیت نے ایسے لوگوں کی افتاد طبیعت یہ بنائی ہے کہ وہ لوگوں کے کام آئیں، ان کی خدمت کریں،ان کے ساتھ عجزوانکساری کے ساتھ پیش آئیں۔ان کی طبیعت میں یہ نقش اتنا گہرا ہوتا ہے کہ جب بندہ کو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کا شرف نصیب ہوتا ہے تو اس کے اوپر یہ احساس محیط ہوتا ہے:

''میرا سر خالقِ کائنات کے قدموں میں ہے۔''

محمد عُبید اللہ درانیؒ

www.ksars.org

سمٹنا اور پھیلنا

حُب حُب حُب۔**فَاحببتُ اَن اُعرَفَ**۔شدت حُب میں اپنا عرفان بے نام بے نشان، کنزِ مخفی، بے چون، بے چگون، مجوب، ملفوف، مرکوزب کا نقطہ ھُوَ۔ وہ۔**واحدہ، لَا اِلٰہَ اِلّا ھُو**۔مگر نورِ سیاہ سے آفتاب نکلنے کے لئے مضطرب۔ نافہ ذات اپنی خوشبوؤں میں پھٹ پڑنے کے لئے بے تاب۔ حُسن ازلی اپنی رونمائی کے لئے بے چین۔ایک شدت ظہور کُن میں ذات نے لباسِ تعینات میں ظہور کیا۔**خَلَقتُ الخَلق** کو عشق کی برق تجلی سے منور کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔اوّل **ماخلق اللّٰہ نُورِی**۔اوّل اللہ نے میرا نور پیدا کیا۔اسی نور سے تخلیق عالم ہوئی۔اب خفا نے غیب میں، شہادت نے شہود میں، باطن نے ظاہر میں رونمائی کی۔حقیقتِ احد، ظہور نورِ احمد صلی اللہ علیہ وسلم بنی۔حقیقتِ محمد رسول اللہؐ عینیت **لَا اِلٰہَ اِلاَ اللہ** ہوئی۔نورِ محمدیؐ نے وحدۃ الوجود کی شان میں جلوہ گری کی۔**وَسِعَ کُلَّ شَیٔ** کے پیرایہ میں ذات کا پھیلاؤ ہوا۔ذات کے رموز اسماء وصفات میں نکھرے۔ب کا نقطہ پھیل کر **بسم اللہ** بنا۔**اِقرَاءُ بِسمِ رَبّکَ**۔قرآن قلب پر نازل ہوا۔حقیقتِ محمدیؐ وجود پر جاری وساری وطاری ہوئی۔سفلی نے علوی کو، وجود نے نور کو سمو لیا۔پہاڑ کو رائی نگل گئی۔**عَرَفَ نفسہ فَقَدعَرَفَ رَبّہ**۔اپنی پہچان ہی رب کی پہچان ہے۔ھوالظاہر ھوالباطن۔ حقیقت محمدیؐ کو سموئے بغیر، ذات کا عرفان کیسے ہو۔باطن میں اسی حق کی جلوہ فشانی، یہ حُب، یہ عشق، یہ تڑپ، یہ شوقِ نمود، یہ آنا، وہی موج اوّل ہے۔**ھُوَالاَوّلُ ھُوَالاٰخِر**۔جب تک ذات میں نہ سمٹے صفات میں کیسے پھیلے۔جب تک رائی پہاڑ کو نہ نگل لے، کیا اگل سکتی ہے۔شاہ نیاز نے فرمایا،

نگل گئی پربت کو رائی دیکھو جی اب اُگلے ہے
نیازؔ کے پردے میں خدائی دیکھو جی اب نکلے ہے

www.ksars.org

اس حالتِ وحدۃ الوجود میں جیسے خدائی اس کھو کھلے وجود سے بہہ رہی ہوتی ہے اور یہ خود اَناڈھر ُ کی کیفیت میں مست ہوتا ہے۔اس کیفیت میں البتہ عاجزی ہوتی ہے۔ سرپائے ساقی پر ہوتا ہے۔ محبوب ہی کی جلوہ آرائی اس کائنات میں نظر آتی ہے۔یہ عبد کا مقام ہے۔میں فانی تو باقی۔نہ کوئی دوئی، نہ وہم، نہ شرک، نہ انانیت، عشق اس وجود میں چھلک اُٹھتا ہے۔

اس کیفیت میں اپنا شعور، عکس ہی تو ہوتا ہے اس حقیقت کا جو جاری و ساری ہے۔ جب عکس سے نظر ہٹ کر اصل پر آجائے، کل کا شعور آجاتا ہے۔بت پرستی اور وجود کے شرک سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مجر دات کے ہم کنار ہو کر اب کہیں یہ وہم دور ہوتا ہے کہ میں خود ایک منفرد چیز ہوں۔ جب کل نظریہ اپنا کر کل ہو جائے، تب صحیح معنوں میں تجرید حاصل ہوتی ہے۔اب کہیں موحد بھی ہوئے اور رحمت و برکت کے دروازے کھلے۔اب کہیں رحمت عالم کے انوار میں آئے۔ برکت کے دروازے کھلنے کی نشانی یہ پائی کہ ایسے معصوم ہو گئے کہ جو قدم اُٹھایا دوسرے اس پر چلنے لگے۔ بالکل اسی طرح جیسے نوجوان لڑکوں کی ٹولیاں بے حیل و حجت ایک دوسرے کے ساتھ چلنے لگتی ہیں۔ جمعیت میں یہ رنگ، رحمت کے تجریدی انواروں میں ملتا ہے۔

اب جمعیت کے معنوں میں ہر فرد اپنی انفرادیت سے پھیلا ہوا فرد ہوتا ہے۔اب کہیں جانِ من جانِ عالم کے مصداق ہوئی۔ اپنی انفرادیت کا پھیلاؤ ایک تلوار کی دھار والی زندگی ہوئی جو میان سے باہر نکل آئے۔کیونکہ جو میان میں پناہ لے کر بیٹھ جائے، سمٹ جائے، وہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ سمٹنا ہو تو ایسا مرد بنے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں جگہ ملے۔ یہاں زندگی کے سرچشمے ہیں۔ یہاں فقرِ غیور اور عشق و ایمان ایک کوندنے والی بجلی کی طرح ہوتا ہے۔ یہاں عاجزی، صبرِ واستقامت میں اپنی خودی کو اپنا لیا جاتا ہے۔یہ فقر غیور اب کائنات میں پھیلتا ہے، انفرادیت کے جنجالوں سے نکل کر جمعیت کے رنگ میں اس عالم میں جلوہ آرا ہوتا ہے۔اور اس طرح ذات میں سمٹا بھی اور جمعیت کے رنگ میں پھیلا بھی۔ان دونوں کیفیات یعنی سمٹنے اور پھیلنے میں حیات ہے، دوام ہے۔ گویا سمٹنے کی شدت ہی ہوتی ہے جو پھیلنے کی محرک باطنی قوت بنتی ہے۔یوں صرف توحید کو لے کر سمٹنا ناکافی ہے۔

www.ksars.org

منصور حلاج بھی صرف توحید کو لے کر سمٹے یعنی صرف آدھا کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عینیت محمد رسول اللہؐ اور اصل سنت کو لے کر نہیں سمٹے۔ یہ سنت اُمتی اُمتی تھی جو معراج میں اپنی خودی کی تڑپ بنی رہی اور واپس آکر جس کے ذریعہ شرعی زندگی کا اجراء ہوا۔ کلمہ کا یہ دوسرا حصہ محمد رسول اللہؐ ہی نشانی ہے ذات میں سمٹ کر پھیلنے کی۔ کلمہ کی پوری توحید کو اپنا کر سمٹے اور پھیلے تب کہیں وہ سادہ لوح بدو بن سکتا ہے جو قیصر و کسریٰ کے قالین اپنے نیزوں سے ہٹا پھینک کر خدا کے فرش پر بیٹھ کر متوکل ہو جاتے تھے۔ یہ بے نیازی اور سادگی ان کے حق الیقین کی نشانی تھی ،ان سادہ مزاجوں کی زندگیوں میں ملت اسلامیہ کے ہر اونچ نیچ، نفسا نفسی کو ختم کر کے، اجتماعیت کے رشتے میں مضبوط بن کر، محبت کے میدان میں اُبھر رہی تھی۔

بغیر نسبتِ محمدیؐ صرف توحید کو لیں۔ جو دوسرے مذاہب والے بھی کوشش کرتے ہیں۔ تو رب العالمین تو نہ سمٹے ہیں نہ پھیلے ہیں۔ **الاٰنَ کما کان**۔ ایسی خشک توحید سے کیا حاصل۔ یہ افیون کا سا نشہ، بے فیض بے مقصد زندگی کی شدتوں کو بھی پھیکا کر دینے والا۔ اسی لئے بزرگان دین نے فرمایا کہ خلقت کو چھوڑا تو خالق کو چھوڑا۔ مقصد حیاتِ مسلم صرف خالق کی حمد و ثناء میں محو ہو کر رہ جانا نہیں ہے بلکہ اس ایمان اور محبوبیت کی خوشبو کو عملی زندگی کے پہلوؤں میں خلقت میں پھیلانا ہے۔ اسی کیفیت کو نصیب کرانے کے لئے قرآن کریم نے **یَتَفَکَّرُون** کی جانب توجہ دلائی ہے۔ یہ وہ حالت ہے کہ دل، دماغ عشق، عقل ایک ہی یکتائی میں یک رُخی میں ہوتے ہیں۔ یہ وہ یکتائی ہے جو کائنات وجود میں، نور عشق کی توحید، انوار محمدی کی صورت میں گامزن ہے۔ یہ کیفیت اس استغراق سے بالکل جدا ہے جس کے ذریعہ کچھ آگہی نصیب ہو جاتی ہے۔ اسماء اور روح اعظم سے بھی رابطہ ہو جاتا ہے۔ **یَتَفَکَّرُون** کے پیچھے تو ترغیب ہے کائنات میں پھیلنے کی۔ اپنے وجود سے صعود کرنے کی، محبوبیت کے انوار میں شدتیں حاصل کرنے کی، حقیقت محمدیؐ تک رسائی کی جو **وَسِعَ کُلَّ شیٔ** ہے۔ یہ مقام جبروت ہے، مقامِ رحمت ہے، مقام محبوبیت ہے۔ اس محبوبیت کے طفیل یہ مقام امر ہے، عالم کن کی بات ہے۔ محبوبیت میں ایک نظر کی بات ہے۔ یہ نظر پیدا ہوتی ہے تصور سے جو ذکر سے آگے کی بات ہے۔ تصور میں آگئے محبوب آنکھوں میں بسا ہے۔ جس کو دیکھا محبوب کی صورت نظر آئی۔ دوئی اور غیریت نہ رہی۔ اب یہ نظر جس پر بھی پڑ گئی کام کر گئی۔ یہ نظر ہی **یَنظرُ بِنُورِ اللّٰہِ** ہے، یہ محبت کے سمندر کی موج ہے جو سب کو ہی بھگوتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ اپنا ہو،

www.ksars.org

اجنبی ہو، کوئی تفرقہ نہیں۔اس لئے کیا عبارت، کیا اشارت، کیا نظر کیا کلام۔ یہ ایک ہی کے بس کی بات ہے کہ مجسمہ محبت ورحمت ہو، بحرِ علم و عرفان ہو، یہ ازلی چیز ہے، اپنے بس کی بھی بات نہیں۔ان انوار میں کلام قلب پر نازل ہوتا ہے۔البتہ کلام کی حقیقت اسی وقت بنتا ہے جب بحرِ حقیقت انوار محمدیؐ سے رابطہ ہو، محبوب سامنے ہو،اور عاجزی اور توکل کی کیفیت ہو تو تختیاں بھی اترتی ہیں، آیات بھی قلوب پر نازل ہوتی ہیں۔

پھر جیسے ایک بجلی سی کوند گئی۔اب یہ حال ہوتا ہے کہ جو اندر ہے وہی باہر اور اس کی تائید قرآن مجید سے ہوتی جاتی ہے۔اس کیفیت میں قرآن کریم کو سمیٹو تو نافہ ذات کی طرح بائے بسم اللہ کے نقطے میں مرکوز ہو کے رہ جاتا ہے۔ قطرہ میں دریا، آنکھ کے تل میں کائنات۔قرآن کو پھیلاؤ تو کس کی بساط جو اس کی معنویت کو پھیلا سکے۔ یہ تو ہزار عالمین، زمان و مکان کی حدود سے صعود کر جانا ہے۔ جیسے خوشبوئے دوست، عکس رخسار، سرِّ کن ظہور فیکون۔اس سمٹنے پھیلنے کے درمیان برزخ محمد رسول اللہؐ ہے۔اس برزخ حقیقت محمدیؐ کی تجلی تب ہی ہے جب آئینہ ملے۔ قلب مجلی آئینہ کے مقابل آئینہ۔ایک ہی عکس رخسار، وجود سے ماوراء۔ نظارے اور نظر کی یکتائی۔ نہ دوئی، نہ غیریت اب کہیں اپنے باطن کا عرفان ہوتا ہے۔ **عَرَفَ نَفسہٗ** کی تجلی ہوتی ہے۔اب کہیں ناسوت سے علیحدہ ہوئے، جبروت میں پہنچے۔

یہ **عَرَفَ نَفسہٗ** نفس کے عرفان تک کی بات رہی تو نسخہ ولایت ضرور ہے۔اپنے مقام تک پہنچا دیتا ہے، ایک جذب ایک گم شدگی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر غور سے سوچیں کہ اللہ نے ہمیں کیوں پیدا کیا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر ایک فطری تڑپ ہے، پھیلنے کی جو دراصل ظل ہے اسی حق کی خود نمائی کا۔ یہ پھیلنے کی بات ایسی ہے جیسے کہ شاعر کو بغیر کلام سنائے چین نہیں پڑتا یا پھر ایک معصومیت کے انداز میں پھول، کہ خوشبو خود بخود پھیلتی ہے۔ ہر متلاشی حق کو، حقیقت کا نقطہ پالینے کے بعد یہ تڑپ ضرور ہوتی ہے کہ جب تک **اَلَم نَشرَح** نہ ہو زندگی تو مکمل ہو جاتی ہے مگر حیات کی تکمیل نہیں ہوتی۔

پھیلنے کے بھی دو پہلو ہیں۔ایک تفریدی، ایک تجریدی، طریقت کا راستہ تفریدی ہے اور حقیقت کا تجریدی۔ تفریدی پہلو میں اپنا وجود جاذبِ خلائق ہوتا ہے اور فرد سے فرد کو فیض یا روشنی ملتی جاتی ہے۔ بتّی سے بتّی جلتی جاتی ہے۔اس تفریدی

www.ksars.org

پہلو میں بھی پھیلنے سے سمٹنا ہے۔مادی زندگی کو بجائے پھیلانے کے سمیٹنا ہر غیر اللہ کی لَا۔ اپنے نفس اپنے وجود کی بھی لَا۔ اس لئے یہ فنا، یہ مُو تُو ا قَبلَ اَن تَمُو تُوا۔ جس معنی میں بھی اور جس سطح پر بھی لو، صرف سمٹنے کا راستہ ہے۔ یہ مردار کیفیت نہیں ہے بلکہ یہ بھی ایک مرد ہی کا کام ہے۔ایک عاشق ہی کے بس کی بات ہے کہ سرِّ خفا، کنزِ مخفی سے روشناسی کے بعد بھی سر محبوب کے قدموں میں ہو۔ میں فانی تو باقی۔ محبوب میں بقا۔ پھر اسی کیف، اسی خوشبو میں پھیلنا، یہ اپنے نافہٗ ذات کی خوشبو ہے جو در حقیقت اسی حق کی اپنے اندر تجلی ہے، جب تک عالم جبروت سے بارانِ رحمت نہ ہو۔ کس کی مجال کس کے بس کی بات کہ پھیلے۔اس تفریدی راستے میں، بظاہر کتنا ہی عجز ہو۔ کہیں نہ کہیں "میں" ضرور شامل ہوتا ہے، اس کیفیتِ خود آگہی، عَرَفَ نَفسہ میں سراپائے یار پر رہنا آسان بات نہیں۔ امام غزالیؒ نے بھی اس کی تنبیہ کی ہے۔ یہ اَنا ہوتی تو بڑی زبردست ہے کہ کسی معمولی بات پر کسی فقیر کی تیوری پر بل آئے تو بیڑہ ہی غرق ہو جاتا ہے، البتہ انفرادی خدمت کے مواقع بھی بہت ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ کچھوے کی طرح اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد اپنے خول میں واپس ہو جاتے ہیں، مشکل سے ہی اپنے پر ہاتھ رکھنے دیتے ہیں۔اور مرد میدان وہ ہوتے ہیں جن کی طاقت اپنی ریڑھ کی ہڈی یعنی باطن میں ہوتی ہے۔ یہ خلقت کے کام آتے ہیں۔ کم از کم انسان تفریدی راستے میں بھی اتنا تو ہو کہ پھیل سکے، دوسروں کے کام آسکے۔

تجرید میں تفرید کے بالمقابل نہ کوئی تیوری نہ کوئی بل، یہاں انفرادیت کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ ایک عالمی غم ہوتا ہے۔ نہ معلوم کیوں آنسو آتے ہیں۔ اگر اپنے آپ سے بھی پوچھیئے کہ کیا غم ہے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کیونکہ یہ شعور سے بالاتر بات ہے ۔ یہ نامعلوم بے معنی سے آنسو در حقیقت عالمِ جبروت کی بارش ہوتی ہے۔ جہاں محبت ہی محبت، رحمت ہی رحمت ہے نسبت محمدیؐ ہے۔

اس عالمِ رحمت میں اِک ہوا سی چلتی ہے جس کو زمانہ اپنا لیتا ہے۔ اب رہا یہ کہ کیا یہ کیفیت اپنے بس کی بات ہے تو ہاں جب یہ لفظ اپنا تختی سے مٹ جائے تو اپنے بس کی بات ہے کیونکہ اب محبوب سے کوئی دوئی نہیں۔ جامع اور مکمل انسان وہی ہوا جو باطن میں سمٹا ہوا اور ظاہر میں پھیلا ہوا ہو۔ فطرت کے لیل و نہار کے ساتھ ہم آہنگی یہی ہے کہ دن

www.ksars.org

دنیا کا، رات یار کی، دن میں طریقت کو اپنایا۔ رات کو حقیقت کے سمندر میں غوطے لگائے۔ کوئی موتی ملا نہ ملا، اپنا مقدر ہے۔

سائنس کے نقطۂ نظر سے اس سکڑنے پھیلنے کو دیکھیں تو جو زندگی ہے یا ارتقا ہے۔ اس میں بقا کے دو پہلو ہیں۔ ایک اپنی جان کی حفاظت، دوسرے اس کی نشو و نما اور تسلسل کی پیہم کوشش، اس کے لئے تحت الشعور اور جبلتوں میں بقا کی وہ وہ قوتیں چھپی ہیں کہ انسان حیرت میں رہ جاتا ہے۔ مگر فرد تو ایک نقطہ ہے، نقطہ ہی سے لکیر بنتی ہے۔ اس طرح فرد کی اہمیت بقائے دوام کے اعتبار سے ہی ادنی سہی مگر وہ ایک اہم کڑی ہے تسلسلِ نسل کی۔ اس سے ایک قدم آگے یا پیچھے جائیں تو یہ جو کائنات کا ارتقا ہوا ہے، اس میں ستارے جو بنے وہ ایک عالمی غبار تھا جو سمٹتے سمٹتے مختلف سورجوں یا ستاروں میں تبدیل ہوا۔ بعض صورتوں میں یہ عالمی غبار سمٹتے سمٹتے اپنی کششِ ثقل سے اتنا ٹھوس بنتا چلا جاتا ہے کہ خود اپنی بے پناہ قوتِ ثقل سے کچلا جاتا ہے اور ایک دم پھٹتا ہے۔ پھر اس سے نظام سیارگان اس ستارے کے ارد گرد وجود میں آتا ہے، اسی طرح **مَن عَرَفَ نَفسہ** جب سمٹتے سمٹتے اپنی باطنی قوت کی شدت اپنے اندر جذب کرنے کی حد سے گزر جاتا ہے تو پھٹتا ہے اور اس کے گرد بھی نظامِ سیارگان کی طرح اس کے کئی بچے کائنات میں پھیل جاتے ہیں۔ اس نظریے کے تحت دیکھا جائے تو سمٹے بغیر اور شدتیں حاصل کئے بغیر پھیلنا کیسے۔ مگر کیا چیز سمٹے، کیا پھیلے، **عَرَفَ نَفسہ** جو سمٹ گیا، جس نے کائنات کو حق کو سمیٹ لیا، پھر وہی حق پھیلتا ہے۔

فرد ہے کہاں، غیر حق کی گنجائش کہاں۔ تو گویا سمٹنے کی حالت میں سب کچھ فنا۔ بس ایک محویت ذات ہے جسے خدا کہہ لو اور پھیلنے کی حالت میں خدائی، تخلیق کائنات بھی اسی طرح ہوئی کہ سمٹی ہوئی ذات صفات میں پھیلی۔ سمٹنے میں حب کی بے پناہ قوت، کن کی قوت ہو کر پھیلی۔ غارِ حرا سمٹنے کا دور تھا، کوہ فاران پھیلنے کی نشانی۔ اُمی ہونا، شدتوں میں سمٹنا اور قرآن، شدت کن میں پھیلاؤ ہے۔ لیلۃالقدر سمٹنا ہے۔ مطلع الفجر ان انوار کا پھیلنا ہے۔ یہ مطلع الفجر ہی خلقت کے کام کی چیز ہے۔ اکثر طالبانِ حق کی سحر مطلع الفجر، وجود سے چھٹکارے کے بعد ہوتی ہے۔ خواہ جیتے جی یا مرنے کے بعد، اسی لئے یہ اس وقت گمنام ہوتے ہیں، نہ کوئی جانتا ہے نہ پہچانتا ہے۔ البتہ صبح وصال کے بعد پھر کہیں وہ پھیلتے ہیں، ظاہر ہوتے ہیں، خلقت کے کام آتے ہیں۔

www.ksars.org

معراج کے واقعہ کو لیا جائے تو معراج کا ایک پہلو سمٹنا ہے اور واپس خلقت میں آنا پھیلنا ہے۔ یہ معراج سے واپس لوٹ آنا کمالِ انسانیت ہے۔ شانِ رحمت کا ظہور، نزول ہی میں ممکن تھا، عروج میں نہیں۔ اس لئے یہ معراج سے واپسی احسان ہے انسانیت پر اُدھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل۔ اس طرح ذات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت محمدی ایک سورج کی طرح سمٹی ہوئی بھی ہے اور دھوپ کی طرح پھیلی ہوئی بھی۔ تو یہ بڑا دھوکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وجود میں آئے، وصال ہوا، اور پردہ فرما گئے۔ نور محمدیؐ تو ہمیشہ سے تھا ہمیشہ رہے گا۔ ایسا سمجھیں کہ **و سِعَ کُر سِیہُ السمٰوٰت** ذات ایک وجود کے آئینہ میں کچھ دیر کے لئے نظر آ گئی۔ آئینہ ہٹا دیجئے تو جو ہمیشہ تھا وہ ہمیشہ ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکڑنے کے بغیر پھیلنا کیسے ہو۔ تفرید کے بغیر تجرید کیسے ہو۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ پہلے خیال آتا ہے پھر وجود آتا ہے اس لئے پہلے تجرید پھر تفرید۔ اس نظریے کے تحت یہ کائنات پہلے پھیلے گی، پھر ایک حد کے بعد سکڑنا شروع ہو جائے گی۔ یہی کچھ ارتقائے حیوانی میں ہو گا پہلے پھیلنا، پھر سمٹنا معنی خیز بات ضرور ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لیا جائے تو ہر ذرہ کائنات کی ابتداء اس کی حیات اور بالآخر اس کا انجام **اِنَا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ راجِعون** ہے۔ پہلے چُھپا خزانہ، پھر اس خزانے کا اظہار، پھر اس کا اپنے اصل کی طرف رجوع۔ یہی کچھ زندگی کی تمام منازلِ ظہور، ارتقا اور اختتام میں نظر آرہا ہے، یہ سمٹنا پھیلنا، ایک لازم و ملزوم سی صفت ہے۔ ایک سلسلہٗ جاریہ ہے۔ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ ہر روز نئی آن نئی شان کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَان۔ تفریدی اور تجریدی دونوں حالتوں میں یہ سکڑنا پھیلنا، حق کے نمود کی ایک شان ظہور بنا ہوا ہے۔ **کُلُّ مَن عَلَیھا فَانٍ وَّ یَبقٰی وجہُ رَبِّکَ ذُوالجَلَالِ وَالاِکرَام**۔ ہر لاالٰہ کی فنا، **وَجہُ ربّک** کی بقا اس وجہ **ربّک** کی آئینہ داری جب قلب میں ہو تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس تفرید، اس آئینہ کی آئینہ داری کرتا ہے۔

تجرید باطن کی بات ہے۔ یہاں محبوب جلوہ افروز ہے۔ وہ عالمِ شوق کی وارفتگی، وہ عشق کی جنوں سامانیاں ایک کیفیت وصال دائم، ہوش کا یہاں دخل کہاں، نہ آرزو ہے، نہ تمنا ہے نہ خواہش، بس طلب ہے تو محبوب کی۔ تصور ہے تو پائے ناز کا، دیدار کی تمنا بھی بے ادبی ہے۔ یہ برزخ محمدیؐ ہے۔ مقام جبروت ہے۔ پہلے ناسوت اور جبروت یعنی حقیقتِ محمدیؐ کے درمیان، شیخ کی صورت برزخ تھی۔ اب محبوب ازلی کی طلب میں نئی حیات ہے۔ فیض و کرم **مُوتوا قَبلَ اَن تَمُوتُوا** نصیب ہو چکا ہے۔ اپنا سب کچھ ختم، نہ دماغ نہ ارادہ، نہ نفس نہ قلب، نہ وجود نہ جان۔ یہ اپنے میں موت، محبوب میں

www.ksars.org

بقا۔اب جیتے جی مرنے کے بعد شیطان کے دخل کی گنجائش کہاں۔اب تو انواروں کی دنیا ہے۔دل ودماغ، وجود سب ایک رخ ہیں، ایک محویت ہے، اپنا پتہ نہیں۔یار ہی کی کارفرمائی ہے۔خیال کی طرح یار بھی ساتھ ہی ساتھ ہے۔

اب نہ صبح ہے نہ شام، نہ فراق ہے نہ جدائی۔نہ زمان ومکان کی پابندیاں ہیں نہ جسم، جان، روح کی قید ہیں، نہ کوئی اجنبیت ہے، نہ غیریت، نہ دوئی ہے نہ وہم، نہ پردے ہیں نہ حجاب۔جدھر دیکھو ایک ہی خورشید عالمتاب کی ضوفشانی ہے۔**رَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ** اسی کا ذکر آسمانوں اور زمینوں، اپنی لطافتوں اور وجود میں بلند ہے۔اسی کی ضوفشانی سے ذرّہ ذرّہ وجود کا چمک اٹھا ہے۔روئیں روئیں سے ذکر چھلک رہا ہے۔ایک سدا سہاگن کا روپ اپنی زندگی کا سہاگ بھی بنا ہوا ہے اور کائنات وجود کا بھی۔اندر باہر ایک ہی جلوہ آرائی ہے۔سمٹو، پھیلو سب کچھ ایک ہی کیفیت ہے۔نافہ ذات میں دیکھو یا باہر گیسوئے مشکین کی خوشبو بن کر پھیلو ایک ہی بات ہے، یہ مقام تجرید ہے۔اس کا سمٹنا بھی حسین، اس کا پھیلنا بھی حسین۔جو خوشبو اپنے وجود کے باطن میں ہے، وہی باہر پھیل رہی ہے۔جو خیال اپنے باطن کی گہرائیوں میں جاگ اٹھا ہے وہی عالمِ امکان میں عملی پیرایہ میں لوگوں کی زندگیوں میں حیات نو کی شکل میں اُبھر رہا ہے۔جو روشنی اپنے باطن وجود میں برق بن کر چمکی وہی زمانے میں نئی تابندگی بن کر جلوہ فگن ہوئی، جو تلاطم اپنے مرکزِ وجود میں آیا وہی طوفان بن کر عالمِ امکان میں پھیلا۔جو شکل اپنے باطن میں اُتری اسی کا عکس عالمِ امکان کے باہر آئینہ میں نظر آیا۔اور آئینے سے آئینے بنتے چلے گئے۔یہ تجرید میں سمٹنے اور پھیلنے کی بات ہے۔سمٹنے میں شدتیں پھیلنے میں وارفتگیاں، سمٹنے میں کنزِ مخفی، پھیلنے میں خلقت الخلق۔سمٹنے میں کُن، پھیلنے میں فیکون۔ایک ہی وحدتِ وجود، ایک ہی وحدتِ شہود، اسی شمسِ حقیقت میں سمٹنا اسی کی روشنی بن کر پھیلنا۔محبوب میں سمٹنا، عشق میں پھیلنا۔عجز میں سمٹنا، رحمت میں پھیلنا۔معنی قرآن ہو کر سمٹنا، **تَخَلَّقُوا بِاَخلَاقِ** اللہ ہو کر پھیلنا۔حقیقت میں سمٹنا، محمد رسول اللہؐ میں پھیلنا۔ذات میں سمٹنا، صفات میں پھیلنا، ابتدا بھی **اِنّا لِلّٰہ** اور انتہا بھی **اِلَیہِ رَاجِعُون**۔

www.ksars.org

ماخوذ از کتاب، تذکرہ غوثیہ

دھوبن کا لڑکا

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کو سماع کا بے حد شوق تھا اور سماع سے ان کے جذب اور عشق میں تحریک ہوتی تھی۔ایک بار حضرت محبوب الٰہیؒ نے حالتِ جذب میں فرمایا کہ ''دھوبن کا لڑکا بازی لے گیا''امیر خسروؒ بھی وہاں موجود تھے، مصاحبین نے امیر خسروؒ سے کہا''آپ مرشد کریم سے معلوم کریں کہ اس کا مطلب کیا ہے؟''امیر خسروؒ مزاج آشنائے خواجہؒ تھے جواب دیا''اس وقت مرشد حالت جذب میں ہیں اس لئے میں ان سے بعد میں بات کروں گا۔''دوستوں نے پوچھا''ہم کب تک اس کی امید رکھیں؟''امیر خسروؒ نے جواب دیا''دو چار دن میں،اس وقت آپ کی طبیعت معمول پر آجائے گی پھر میں ان سے بات کروں گا۔''امیر خسروؒ نے تیسرے دن اپنے پیر و مرشد کو ہشاش بشاش پایا،وہ بہت خوش تھے۔امیر خسروؒ نے موقع غنیمت دیکھ کر پوچھا،

''حضرت آپ سے کچھ پوچھنا ہے؟''

آپ نے اجازت دے دی۔''خسرو پوچھو کیا پوچھنا ہے؟''

امیر خسرو نے عرض کیا،آپ نے کچھ دن پہلے حالت وجد کے دوران فرمایا تھا کہ '' دھوبن کا لڑکا بازی لے گیا۔''دھوبن کا لڑکا کس طرح بازی لے گیا؟ تمام دوست اس کی تفصیل جاننے کے لئے بے چین ہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے امیر خسروؒ کو سمجھایا کہ اس واقعے میں ایک ایسے عاشق کی داستان پنہاں ہے جو زبردست مثال ہے اور عارفان عشق و محبت کے لئے اس میں عبرت اور رشک کا سبق پایا جاتا ہے۔سنو اور اس جیسا بننے کی کوشش کرو۔

www.ksars.org

حضرت امیر خسروؒ اپنے مرشد کے شیدائی تھے، پوری محویت وانہماک سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ فرمارہے تھے، ''وہ شاہی دھوبن تھی محل سے کپڑے آتے تھے اور پورا کنبہ ان کی دھلائی اور صفائی میں مشغول ہو جاتا تھا۔ دھوبن کا لڑکا بھی ان میں شامل تھا، لڑکے نے شہزادی کے کپڑوں کو اپنے لئے پسند کر لیا تھا۔ وہ ان کپڑوں کو دیکھتا ان کی بو سونگھتا اور شہزادی کے لئے اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس کرتا۔ فارغ اوقات میں وہ شہزادی کے خیالی وجود سے باتیں کرتا رہتا۔ ان باتوں کو جب زیادہ وقت گزر گیا تو اس کی محبت میں شدت بھی زیادہ پیدا ہو گئی پھر گھر والے بھی اس راز سے آگاہ ہو گئے۔ اس کے والدین کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر یہ بات کسی طرح مشہور ہو کر محل کے اندر پہنچ گئی تو بادشاہ کا عتاب اور جلال اس کے خاندان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔

دھوبی نے بیوی کو سمجھایا، ''نیک بخت اس کو سمجھا کہ یہ پاگل پن چھوڑ دے''۔

دھوبن نے جواب دیا، ''میں سمجھاؤں گی ضرور لیکن مجھے یقین نہیں کہ اس پر میری نصیحتوں کا اثر ہو گا''۔

دھوبی نے کہا، ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنا پاگل پن چھوڑے گا نہیں اور ہم سب بلا وجہ مارے جائیں گے''۔

دھوبن کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا تدبیر کرے جس سے اس کا لڑکا اپنے اس لاحاصل عشق سے باز آجائے۔ کافی غور و فکر کے بعد دھوبن کے ذہن میں ایک تدبیر آ گئی۔ کچھ دن بعد اپنے بیٹے کے پاس سوگوار سی گئی اور بیٹے سے پوچھا، ''تو کیا کر رہا ہے؟''

بیٹے نے جواب دیا! ''شہزادی کے کپڑے تہہ کر رہا ہوں''

دھوبن آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگی، ''افسوس کہ اب تو یہ کام نہیں کر سکے گا''

لڑکے نے پوچھا، ''کیوں؟''

دھوبن نے جواب دیا، ''وہ آشیانہ ہی نہ رہا جس پر تجھے ناز تھا''

www.ksars.org

لڑکے نے سارے کپڑے ایک طرف رکھ دیئے اور پوچھا ''ماں! کیا بات ہے؟ ذرا صاف صاف بتائیں''۔

دھوبن نے کہا، ''آج میں محل گئی تھی، وہاں کہرام برپا تھا، محل کے در و دیوار آنسو بہا رہے تھے''۔

لڑکے کا دل ڈوبنے لگا، ''ماں! مجھے صاف صاف بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟''

دھوبن نے جواب دیا، ''محل کی کنیزیں بتا رہی تھیں کہ شہزادی کے پیٹ میں اچانک درد اٹھا، اس درد میں وہ رات بھر تڑپتی رہی۔ طبیبوں نے رات بھر علاج کیا اور آخر صبح کو شہزادی چل بسی اور پورے محل کو روتا چھوڑ گئی''۔

بیٹے نے پوچھا، ''کیا یہ خبر سچ ہے؟''۔

دھوبن نے جواب دیا، ''کیا تو سمجھتا ہے کہ میں زندہ شہزادی کو خواہ مخواہ مار سکتی ہوں؟''۔

بیٹے نے حسرت سے کہا، ''ماں! یہ تو نے کیسی خبر سنائی افسوس کہ میں بے خبر رہا''۔

ماں نے اسے تسلی دی، ''ہاں بیٹے! موت پر کس کو اختیار ہے اور کسی کو بھی کچھ پتا نہیں کہ اس کی موت کب اور کہاں واقع ہو جائے''۔

لڑکے نے سرد آہ بھری! ''درست..... بجا..... موت کا کوئی بھروسا نہیں کہ کب اور کہاں آجائے''۔

ماں نے محسوس کیا کہ بیٹے کی حالت ٹھیک نہیں ہے وہ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ سرد اور زرد....

لڑکے نے شہزادی کے کپڑوں کو بوسہ دیا ''تو اب میں بے کار ہو گیا....... میرا کام مجھ سے چھن گیا اور جب کرنے کو کام ہی نہ رہے تو زندگی بے کار ہے''۔ ماں نے اسکا ہاتھ پکڑ لیا، ''یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟''۔ ماں نے اسکا ہاتھ برف کی طرح سرد محسوس کیا، ''یہ تیرے ہاتھ اتنے ٹھنڈے کیوں ہیں؟''۔ بیٹے نے کوئی جواب نہ دیا اور گرتا چلا گیا۔ ماں نے اس کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر لڑکا زمین پر گر گیا۔

www.ksars.org

ماں نے شور مچایا، ''لوگو دوڑنا دیکھنا میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟''۔

برادری والے بھی آگئے اور دھوبی بھی آگیا اور فرش پر دراز بیٹے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا، ''اس کو کیا ہو گیا؟''۔

دھوبن نے جواب دیا، ''یہی جاننے کے لئے تو میں نے تم سب کو آواز دی ہے۔''

برادری والوں نے لڑکے کی نبض ٹٹولیں اور انہیں نہ پاکر اعلان کر دیا کہ ''یہ تو مر گیا، یہ زندہ ہی کب ہے؟''۔

باپ نے بڑے قلق آمیز لہجے میں کہا'' اپنی زبان سنبھالو، کیسی بری بات نکال رہے ہو۔ تم لوگ جانتے بھی ہو کہ کیا کہہ رہے ہو''۔

ایک بزرگ نے جواب دیا'' بھائی! ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں تیرا لڑکا مر گیا ہے، جس سے چاہے تصدیق کرالے''۔ اب تو پوری برادری میں کہرام برپا ہو گیا۔ دھوبی نے دھوبن سے پوچھا لیکن یہ اچانک کس طرح ہو گیا۔ دھوبن نے پورا واقعہ سنا دیا۔ دھوبی نے دھوبن کی پٹائی کر دی، ''تو نے اپنے بیٹے کو یوں ٹھکانے لگا دیا''۔

دھوبن نے رو رو کر اپنی صفائی پیش کی، ''میرا تو یہ خیال تھا کہ اس طرح مایوس ہو کر وہ شہزادی کا پیچھا چھوڑ دے گا''

دھوبی نے روتے ہوئے کہا، ''کیا خوب پیچھا چھڑایا تو نے! کیا تجھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ عشق کی جو آگ دل میں روشن ہوئی تھی وہ اس طرح نہیں بجھتی۔'' دھوبن روتی جاتی اور کہتی جاتی۔ ''اب تم جو چاہو کہو مجھ کو مارو قتل کر دو کیونکہ اپنے بیٹے کو خود میں نے مار دیا میں اس کی قاتل ہوں''۔ دھوبی نے کہا'' اب میں تجھ کو کیا ماروں گا تُو تو خود ہی جیتے جی مر گئی''۔

دھوبن محل کے اندر جب کپڑے لے کر اندر گئی تو شہزادی کے کپڑے اس کے حوالے کیے۔ شہزادی نے ان پر ایک نظر ڈالتے ہی اعتراض کر دیا، ''اس بار میرے کپڑے کس نے دھوئے ہیں؟'' دھوبن نے جواب دیا، ''اسی نے جو ہر مرتبہ دھوتا ہے''۔

شہزادی نے کہا، ''جھوٹ بالکل جھوٹ یہ میں نہیں مانوں گی''۔

www.ksars.org

دھوبن نے حیرت سے پوچھا، ''وہ کیوں؟اس میں ایسا کیا فرق نظر آیا آپ کو''۔

شہزادی نے جواب دیا، ''کپڑوں کی دھلائی اور ان کے بناؤ سنوار میں جو بات پائی جاتی تھی اس بار نہیں ہے''۔

دھوبن خاموش ہوگئی۔ شہزادی نے پوچھا'' دھوبن! تو خاموش کیوں ہوگئی؟ جواب کیوں نہیں دیتی؟''شہزادی نے اصرار کیا، ''کیا بات ہے؟تو خاموش کیوں ہوگئی میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہی؟''۔

دھوبن نے ڈرتے ڈرتے کہا، ''شہزادی صاحبہ! میں کیا عرض کروں مجھ کو ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی طوفان نہ اٹھ کھڑا ہو''۔

شہزادی نے پوچھا، ''کیسا طوفان؟اور یہ تو رو کیوں رہی ہے؟''۔

دھوبن نے ایک سرد آہ بھری، ''رونا تو میرا مقدر ہے اب میں یوں ہی زندگی بھر روتی رہوں گی''۔

شہزادی کو اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا، ''دیکھ دھوبن تو سچ سچ بتادے بات کیا ہے؟''

دھوبن نے کہا، ''شہزادی صاحبہ! آپ پہلے مجھے یہ یقین دلادیں کہ میں آپ کو جو کچھ بتاؤں گی آپ اپنے تک ہی رکھیں گی، چرچا نہیں کریں گی اور مجھ کو معاف کردیں گی''۔ شہزادی نے وعدہ کیا اور دھوبن نے ہیر پھیر سے بتانا شروع کردیا۔'' شہزادی صاحبہ! میری سمجھ میں تو ابھی تک یہ نہیں آیا کہ وہ آپ کو دیکھے بغیر آپ پر عاشق کس طرح ہوگیا؟''شہزادی خاموش رہی اور دھوبن بولتی رہی۔ آپ کے کپڑے وہ خود دھوتا اور ان کپڑوں کی دھلائی اور بنانے سنوارنے میں آپ کو جو سلیقہ نظر آتا تھا اس میں بھی آپ کا عشق کارفرما تھا ہم سب جب اس راز سے واقف ہوئے تو اسے سمجھانے لگے مگر وہ نہیں مانا۔

پھر شہزادی سے پوچھا، آپ ہی بتائیں کہ یہ بری بات تھی یا نہیں؟۔

شہزادی نے کہا، ''بات کو طول نہ دے مختصر کر''۔

دھوبن نے کہا، ''جب ہمارا سمجھانا کام نہ آیا تو میں نے مکر و فریب اور جھوٹ کا سہارا لیا''۔

www.ksars.org

شہزادی کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی وہ سب کچھ ایک آن میں سن لیناچاہتی تھی بیزاری سے کہنے لگی، ''دھوبن تو باتوں کو خواہ مخواہ طول کیوں دیتی ہے؟''۔

دھوبن نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا، ''اور پھر میں نے رورو کر یہ منحوس جھوٹی خبر سنائی، شہزادی کا انتقال ہو گیااور اب تو شہزادی کے کپڑے نہیں دھو سکے گا۔''شہزادی نے پوچھا، ''پھر؟ پھر کیا ہوا؟'' دھوبن نے جواب دیا'' پھر وہ مایوس ہو کر کہنے لگا کہ ''میں کیا کروں گا زندہ رہ کر، کیوں کہ کرنے کے لئے کوئی کام ہی نہیں رہ گیا...وہ گرااور مر گیا۔''اتنا کچھ بتانے کے بعد دھوبن زار قطار رونے لگی۔

شہزادی کو اس خبر سے بڑی تکلیف پہنچی اس نے آہستہ سے کہا، ''اتنا کچھ ہو گیااور مجھ کو خبر تک نہ ہوئی''۔

دھوبن مسلسل روئے جارہی تھی، ''اگر میں یہ جانتی کہ میرے جھوٹ کا یہ اثر ہو گا تو میں کچھ بھی کرتی مگر یہ جھوٹ نہ بولتی۔''

شہزادی نے کہا، ''تجھ کو اس جھوٹ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟اس سے تم لوگوں کو کیا تکلیف پہنچ رہی تھی؟''

دھوبن نے کہا، ''شہزادی صاحبہ ہمیں خوف تھا کہ یہ خبر آپ کے والد بادشاہ سلامت تک پہنچ گئی تو ہم سب ہلاک کر دیئے جائیں گے''۔

شہزادی نے کہا، ''تم تو یہ کہتی ہو کہ وہ خاموش رہتا تھااور کسی سے بات چیت بھی نہیں کرتا تھا، پھر یہ بات محل تک کس طرح آجاتی؟''۔

دھوبن نے جواب دیا، ''شہزادی صاحبہ! آپ میری برادری کو نہیں جانتیں! اس میں کون ہمارا دوست کون ہمارا دشمن، ہمیں نہیں معلوم لیکن کسی ایک کا حسد یا دشمنی ہمیں موت کے منہ تک پہنچاسکتی تھی''۔ شہزادی کو لڑکے کی موت کا بڑا دکھ تھا—وہ دیر تک افسوس کرتی رہی۔ شہزادی نے پوچھا، ''اس کو تم لوگوں نے دفن کہاں کیا ہے اس کی قبر تک مجھے لے کر جاسکتی ہو؟''۔

www.ksars.org

دھوبن کو بڑی حیرت ہوئی "وہاں آپ جائیں گی، قبرستان پر جائیں گی؟" دھوبن کو خوف ہوا کہیں وہ شہزادی کو محل کے باہر لے جانے کے جرم میں قتل نہ کر دی جائے۔ شہزادی نے کہا، "میں تیرے ساتھ تیرے بیٹے کی قبر پر ضرور جاؤں گی۔ دھوبن نے کہا "کب اور کس طرح؟"

شہزادی نے جواب دیا، "کل میں کنیز کے لباس میں محل کے عقبی دروازے سے باہر آجاؤں گی وہاں تم مجھ کو مل جانا"۔ دھوبن پر بادشاہ کی دہشت طاری تھی وہ اس کام کے لئے تیار نہ تھی جب دھوبن کو یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو یہ باتیں بادشاہ تک پہنچا دی جائیں گی تو وہ تیار ہو گئی۔ دوسرے دن حسب وعدہ شہزادی کنیز کے لباس میں محل کے عقبی دروازہ سے باہر نکلی وہاں دھوبن اس کی منتظر تھی وہ دونوں لڑکے کی قبر پر گئیں۔ شہزادی قبر کو دیکھتے ہی رونے لگی۔ دھوبن بھی روتی جاتی اور شہزادی سے پوچھتی جاتی تھی، "آخر آپ کیوں رو رہی ہیں؟"۔

شہزادی نے جواب دیا "میں یہ سوچ سوچ کر رو رہی ہوں کہ آج بھی ایسے درد مند دل موجود ہیں جو اندر ہی اندر جل اٹھتے ہیں، عشق کرنے والے خاموش عاشق۔ اس کا کتنا بڑا ظرف تھا بے لوث، بے غرض، نہ کوئی مطالبہ نہ کوئی گلہ"۔ دھوبن حیران تھی کہ اس کے بیٹے کے عشق کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد دھوبن نے کہا،

" شہزادی صاحبہ! اب آپ چلیں"

شہزادی نے پوچھا، "کہاں؟ کہاں چلیں؟" دھوبن نے جواب دیا "محل، وہاں آپ کو نہ پاکر ایک قیامت اٹھ کھڑی ہو گی"۔

شہزادی وہاں بیٹھ گئی اور کہنے لگی "مجھ میں چلنے کی سکت بھی نہیں رہی۔ مجھ سے تو چلا بھی نہیں جائے گا"۔

دھوبن پریشان ہونے لگی، "شہزادی صاحبہ! آپ کیا کہہ رہی ہیں، آپ کو واپس اپنے محل چلنا ہے"۔ اب شہزادی سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا اس کا دل ڈوب رہا تھا،

www.ksars.org

''دھوبن یہ مجھ کو کیا ہورہا ہے مجھ سے بیٹھا بھی نہیں جارہا، میرا دل ڈوب رہا ہے۔'' دھوبن نے اس کو سنبھالنے کو کوشش کی مگروہ گر گئی۔ اسکی حرکت قلب بند ہوگئی اور وہ بھی خاموشی سے چل بسی۔ دھوبن نے بھاگنا چاہا لیکن شاہی ہرکاروں نے اسے گرفتار کرلیا جو خاموشی سے شہزادی اور دھوبن کا تعاقب کرتے چلے آئے تھے۔ بادشاہ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ بادشاہ نے تخلیہ میں یہ روئیداد سنی اور دونوں کے حال پر افسوس کرنے لگا۔ اس نے دھوبن سے کہا'' تجھے شہزادی کو اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہیے تھا''۔

دھوبن نے عرض کی ''میں موت کے خوف سے شہزادی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی''۔ بادشاہ نے پوچھا،''اب تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ کیا تو موت سے بچ جائے گی؟'' دھوبن نے جواب دیا''اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اگر موت پیچھا کرلے یا کررہی ہو تو انسان اس سے بچ نہیں سکتا۔ اب میں موت سے نہیں ڈرتی''۔ بادشاہ نے کہا''اگر تو موت سے نہیں ڈرتی تو موت بھی تجھ سے دور دور رہے گی۔ جاؤ میں نے تجھے معاف کیا لیکن دیکھ اس کا چرچا مت کرنا، اس طرح رہنا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو''۔

دھوبن کو اپنی جاں بخشی پر یقین نہیں آرہا تھا اس نے پوچھا،''کیا میں جاؤں؟''۔ بادشاہ نے کہا، ''ہاں تو جا''۔ دھوبن اپنے گھر چلی گئی۔ یہ واقعہ خوب مشہور ہوا مگر بادشاہ کی موت کے بعد۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ قصہ سنانے کے بعد فرمایا،

> ''ہم میں کون اتنا بڑا عاشق ہے؟۔ کسی شے اور کسی صلے کی تمنا کئے بغیر عشق کرنا بہت دشوار امر ہے۔ عشق تو ایک کشش ہے۔ مقناطیس کی کشش کے دائرے میں جب لوہا آجاتا ہے تو لوہے کی اپنی طاقت اور قوت مغلوب ہوجاتی ہے اور مقناطیس کی کشش لوہے کو اپنی ذات کے قریب کرلیتی ہے۔ مقناطیس سے قریب ہونے سے پہلے لوہا بننا ضروری ہے یعنی مقناطیس کی کشش کے آگے لوہا اپنے آپ کو قطعی طور پر بے بس بنالیتا ہے۔ اپنے اندر کی تمام قوت کی نفی کرکے مقناطیس کی کشش کو قبول کرلیتا ہے تو وہ مقناطیس سے مل جاتا ہے۔ قانون قدرت یہ ہے کہ کوئلہ جب آگ میں ڈالا جاتا ہے تو آگ کی گرمی کو اس حد تک جذب کرلیتا ہے کہ خود آگ بن جاتا ہے۔''

اس کے بعد ایسا لگا کہ محبوب الٰہیؒ عشق حقیقی میں جذب ہوگئے ہیں۔ آپ نے فرمایا''پس اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے بھی خود اپنی ذات کی نفی کرنا لازمی ہے۔ مقناطیس کی قربت لوہے کو بھی مقناطیس بنادیتی ہے۔ اللہ کے بندے جب اللہ کی

www.ksars.org

محبت میں اس سے قریب ہو جاتے ہیں تو ان کے ہر قول اور ہر فعل میں اللہ کی ضمانت اور مخلوق کی شہادت شامل ہو جاتی ہے۔"

محبوب الٰہیؒ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ آپ کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ چند لمحوں بعد آپ نے نگاہیں اٹھائیں اور فرمایا،

"پتہ نہیں عشق کو غم اور دل کی لگن کو سوز کیوں کہا گیا ہے۔ اگر عشق واقعی آگ ہے تو پھر وہ عشق نہیں ہے۔ عشق میں تو انگ انگ زعفران زار بن جاتا ہے۔ دل میں گداز داخل ہو جائے تو آدمی کے اوپر عالمین کی تخلیق کے اسرار کھل جاتے ہیں۔ عشق تو اللہ کی صفت ہے۔ اللہ نور ہے۔ اللہ کی ہر صفت نور ہے۔ اللہ جب نار نہیں تو اس کا عشق کیسے نار بن سکتا ہے۔ جو آدمی عشق کو نار اور سینے کی جلن سمجھتا ہے دراصل اس کا دل عشق کے نور سے خالی ہے کیونکہ نور و نار ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ جس دل میں عشق الٰہی کے انوار ذخیرہ ہو جاتے ہیں وہ دل تجلی کا ایک نقطہ بن جاتا ہے۔ عشق الٰہی کا نور قلب میں جذب ہو کر قلب کی آنکھ بن جاتا ہے۔ قلب کی آنکھ اللہ کے نور سے غیب کے عالمین کو دیکھتی ہے اور اللہ کی نعمتوں کو دیکھ کر غم نہیں بلکہ سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جو عشق سینے میں رقابت کی آگ بھڑکائے اور دلوں میں حسد پیدا کرے اس کو بوالہوسی کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔"

www.ksars.org

ضمیراللہ بخاری

عشق مجازی سے عشق حقیقی تک

اگر چہ ترک تعلق بھی کرلیا تو نے
رہا نہ تجھ سے کوئی ربط عاشقی اے دوست
نہ جانے کیوں رہِ مستی میں ہر قدم پھر بھی
ہے ہم سفر تیری یادوں کی چاندنی اے دوست

اس عظیم گمنام اور محسن ہستی کے نام جس کی یادیں میری زندگی کا حاصل بن چکی ہیں۔ وہ عظیم خاتون کہاں ہے جس کو تلاش کرتے کرتے میں خود کو گم کر بیٹھا ہوں۔ رفعت کے مطالب اعلیٰ وارفع مقام کے لئے جاتے ہیں۔ یہ پھول جیسا خوب صورت اور شہد سے زیادہ شیریں نام خوش بختوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔

یہی نام میری زندگی کا ایک اہم راز بن گیا ہے۔ یہ نام مجھے کتنا عزیز ہے کتنا پیارا ہے یوں لگتا ہے یہ نام میرا جنم جنم کا ساتھی ہے، اس کے بغیر میں اپنے آپ کو نامکمل، ادھورا اور تنہا تنہا سا پاتا ہوں۔ یہ نام زندگی کے اس چلچلاتے، لق ودق ریگستان میں ایک سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رواں دواں رہتا ہے۔ اب جب کہ میں جوانی کی سرحد پار کرکے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا ہوں مگر یہ حقیقی حادثہ جس نے میری زندگی کا رُخ ہی موڑ دیا، مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ وقت ہے کہ دبے پاؤں آگے کھسک رہا ہے اور بہتے دریا کی طرح مجھے بھی اپنے ساتھ آگے بڑھا رہا ہے۔ زندگی کو یوں بھی تو ثبات نہیں، یہ ایک بے اعتبار ساتھی ہے کوئی پتہ نہیں یہ کب ساتھ چھوڑ دے، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ سانس کا رشتہ ٹوٹنے سے

www.ksars.org

قبل اس حقیقی واقعے کو سپرد قلم کردوں۔اس آس پر کہ شاید یہ چند سطریں میری اس محسن ہستی کی نظر سے گزریں جس کی حسین یادوں کی امانت کو میں اب بھی اپنے سینے سے لگائے جی رہا ہوں۔

جہاں چھوڑا تھا تیری آرزو نے
سنا ہے زندگی اب تک وہیں ہے

قارئین کرام !اس حادثے کی ابتدا تقسیم ہند سے قبل امرتسر شہر سے شروع ہوئی تھی یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں نویں یا دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔اغلباً 39/ 1938 کا زمانہ تھا۔

میری پیدائش ایک دین دار اور مذہبی گھرانے میں ہوئی اسی وجہ سے میں بچپن ہی سے صوم وصلوۃ، تہجد ودرود وظائف پر سختی سے عمل پیرا رہا۔میرا یہ بچپن اور بھول پن کا زمانہ تھا یہی وجہ ہے کہ مجھے ہر خوب صورت چیز اچھی لگتی۔سبزہ، پھول، فوارے، رنگ برنگ تتلیاں، غرض ہر چیز مجھے اچھی لگتی اور میرا جی چاہتا کہ ہر وقت میرے گرد خوب صورت چیزیں رہیں۔ہاں تو میں عرض کررہا تھا کہ میرا مسکن، محلہ ''کٹڑہ مہان سنگھ'' شہر امرتسر میں ملکہ وکٹوریہ کے مجسمے کے قریب تھا ۔میں ایم۔اے۔او۔ہائی اسکول کا(جو بعد میں کالج بن گیا تھا)طالب علم تھا۔یہ اسکول میرے گھر سے تقریباً اڑھائی میل کی مسافت پر تھا۔

زیر تحریر واقعے کی ابتداً ''محلہ چوک فرید'' کی ایک گلی سے ہوتی ہے، یہ محلہ میرے اسکول اور گھر کے درمیان پڑتا تھا ۔معمول کے مطابق چار بجے شام اسکول سے فارغ ہو کر میں اپنے گھر اپنے منتخب راستے سے جس میں بے شمار گلیاں، کوچے بازار پڑتے تھے گزرتا تھا۔اگرچہ گھر جانے کے لئے اور راستے بھی تھے مگر لاشعوری طور پر مجھے یہی راستہ زیادہ پسند تھا اور آمدورفت کا یہ سلسلہ میری تعلیم کے اختتام کے بعد بھی جاری رہا۔

بہار کا موسم تھا، پھول ہی پھول کھلے تھے۔ایک کیفیت کا عالم تھا اور جوانی کا سویرا نگاہوں کے دریچے سے جھانک رہا تھا ۔عصر کے سہانے وقت آکاش پہ کہیں کہیں بادل آوارہ پھر رہے تھے۔ دھیمی دھیمی نسیم بہار سمندر کی خاموش لہروں کی طرح فضا کو اور بھی سحر انگیز اور عطر بیز بنا رہی تھی۔نہایت ہی روح پرور سماں تھا۔اسکول سے فارغ ہو کر میں حسب

www.ksars.org

معمول بغل میں کتابیں دبائے چوک فرید کی ایک پیچ دار گلی سے گزر رہا تھا۔ یاد آیا، اس گلی میں ایک مسجد بھی تھی (گلی کا نام یاد نہیں آرہا) مسجد کے ملحق ایک گھر تھا، اسی گھر کے سامنے اس کہانی نے جنم لیا۔ ہاں تو میں بھی ہر طالب علم کی طرح شوخ وبے باک شرارتیں، کسی سے مذاق، کسی سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہوا مستقبل میں آنے والے حالات سے بے خبر گلی سے گزر رہا تھا۔

مذکورہ مکان کے قریب ایک لڑکی کوئی بارہ تیرہ برس کا سن، اپنے ننھے منے بھائی یا بہن کو گود میں لئے کھلا رہی تھی۔ کھیلتے ہوئے اچانک اس کا پاؤں کسی چکنی چیز سے ایسا پھسلا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور ننھے بچے سمیت دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ لڑکی کے گرتے ہی میں لپک کر آگے بڑھا۔ اُس کا بازو پکڑ کر سہارا دیا اور پھر بچے کو اٹھا کر اس کی گود میں دے دیا اور ساتھ ہی پوچھا، آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ اس دوران لڑکی نے اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ لیکن بدستور کپڑوں سے گرد جھاڑنے میں مصروف تھی۔ کٹورا سی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر بڑے بھول پن سے جواب دیا، "ہاں چوٹ لگی ہے" (حالانکہ بظاہر اسے کوئی چوٹ وغیرہ نہیں لگی تھی) اس حاضر جوابی سے مجھے سمجھنے میں ذرا بھر دیر نہ لگی کہ لڑکی بلا کی ذہین وزیرک ہے۔ میں نے بات بڑھاتے ہوئے کہا، "آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" "کیوں اس کی کیا ضرورت ہے؟" لڑکی نے طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "میرے خیال میں نام پوچھنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔" میں نے بھی قدرے دلیری سے جواب دیا۔ لڑکی کچھ تامل کے بعد بولی، "میرا نام رفعت ہے۔"

اس نام میں کوئی جادو تھا یا آواز اتنی سحر انگیز تھی کہ میں وہیں سحر زدہ سا کھڑا رہ گیا اور اس کو دیکھنے میں محو ہو گیا جس نے ساری عمر مجھ پر حکومت کرنا تھی۔ کتنی معصومیت اور بھول پن تھا اس چہرے میں۔ رفعت بہت خوب صورت تھی، متوازن صحت، کٹورا سی آنکھیں، گلاب کی سی رنگت، جیسے قدرت نے اس کے وجود کی تشکیل میں حسن وشباب کی تمام تر رعنائیاں یکجا کر دی ہوں۔ معصوم سے چہرے پر پھیلی شرارت، لطیف آواز کی مٹھاس، میں انہی میں گم سم کئی لمحے یوں ہی کھڑا رہا اور پھر بادل نخواستہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ چلتے وقت میں نے محسوس کیا کہ رفعت کے چہرے پر اداسی اور افسردگی کی چھایا سی پڑ گئی ہے۔ رفعت اسی جگہ بت سی بنی مجھے اس وقت تک دیکھتی رہی تا وقتیکہ میں خود ہی چلتے چلتے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر گلی سے باہر نکل گیا۔

www.ksars.org

اس واقعے کو گزرے چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے لیکن وہ چہرہ وہ منظر ہر وقت، ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور اب تو ان کی رفاقت سے اتنا مانوس ہو چکا ہوں کہ ان کے بغیر ہر شے کو نامکمل اور دھواں دھواں سا پاتا ہوں۔اس دوران زندگی کے افق پر بے شمار چہرے ابھرے لیکن چہروں کے اس ہجوم میں بس ایک ہی چہرہ ایسا تھا جو تمام تر دل فریبیوں، تلخ اور شیریں یادوں کے ساتھ ہر آن میرے احساسات سے پیوست رہا۔ بہر حال مختصراً 1939ء میں، میں نے میٹرک کا امتحان نمایاں حیثیت سے پاس کر لیا۔اس سال ستمبر میں دنیا کی طویل اور ہولناک جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ تلاشِ روزگار مجھے امرتسر سے لاہور لے آئی۔ایئر فورس میں بھرتی شروع تھی، میں بھی سلیکشن کمیٹی کے روبرو انٹرویو کے لئے پیش ہوا اور بالآخر ایئر فورس میں بحیثیت انجن ٹیکنیشن منتخب ہو کر دنیا کی اس ہولناک ترین جنگ کی صف میں شامل ہو گیا۔ جنگ کے دوران مجھے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔اللہ کا فضل تھا۔دولت دنیا کی فراوانی، کاریں سواری کے لئے، رہنے کے لئے پر تکلف رہائش اونچی سوسائٹی میں تھی۔دوست احباب نے شادی کے لئے اصرار شروع کر دیا۔خوب صورت تعلیم یافتہ لڑکیاں دیکھیں بھی اور دکھائی بھی گئیں لیکن جس چہرے کی مجھے تلاش تھی اس کا ذرا سا پرتو بھی تو ان چہروں میں نہیں ملتا تھا بقول شفیع عقیل،

سورج چاند ستارے سارے جائیں پھر آجائیں

جس چہرے سے روپ تھا ان کا، اسے کہاں سے لائیں

آخر کار وہ وقت بھی آ گیا جب مجھے ہندوستان کی حدود سے تجاوز کر کے غیر ممالک برما، رنگون، ملائشیا، جاپان وغیرہ جانا پڑا ۔جنگ کی ہولناکیاں، تباہ کاریاں، آبادیوں کا زیر وزبر، انسانوں کی بے گور وکفن لاشیں، مجبورمائیں، بھوک سے نڈھال ننھے منے بچے، دشمن کی پے درپے دل دہلا دینے والی بمباری، خندقوں میں پناہ لینا۔ ہر طرف موت کے سائے، انہی دل دوز حالات سے ہر وقت دن ہو یا رات سامنا رہتا۔

مگر ان تمام ہولناکیوں اور حوصلہ شکن واقعات کے باوجود رفعت کا چہرہ ہمیشہ میرا مونس وہمدم رہا، کڑے سے کڑے وقت بھی یہ چہرہ میری ہمت بڑھاتا رہا، میرے حوصلوں کو جلا بخشتا رہا۔کئی دفعہ موت کے بے رحم پنجے میری جانب پوری رفتار سے بڑھے لیکن میرے اور موت کے درمیان ہمیشہ یہ چہرہ سپر بن کر کھڑا ہوتا۔وہاں ایک دفعہ ہم تین چار ساتھی جاپانیوں

www.ksars.org

کی مسلسل اور اندھا دھند بمباری سے بچنے کے لئے ایک قریبی خندق میں جا چھپے، خندقیں زیڈ (Z) شکل کی بنی ہوئی تھیں۔ دشمن کی طرف سے ایک گرنیڈ جو بیس پچیس انسانوں کے پرخچے اڑانے کے لئے کافی تھا۔ ہماری خندق کے عین وسط میں آکر گرا۔ آن واحد میں رفعت کا ہیولا سامنے آیا۔ جس نے پوری طاقت اور بسرعت مجھے اٹھا کر خندق سے باہر پھینک دیا۔ اسی لمحے ایک قیامت خیز دھماکہ ہوا۔ جس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ اب جب آنکھ کھلی تو ایک قیامت کا سماں تھا، فضا اب بھی گرد آلودہ تھی، ایک ہو کا عالم تھا۔ میرے عزیز دوست، غم گسار جو چند لمحے قبل میرے پاس موجود تھے وہ خود تو مجھے کیا ملتے، ہاں ان کے جسمانی اعضا جا بجا بکھرے پڑے تھے جنہیں دیکھ کر مجھے خیر خواہ دوستوں کا انجام سمجھنے میں ذرا بھر دیر نہ لگی۔ ان جانباز رفیقوں کی مغفرت کے لئے فاتحہ پڑھی اور پھر ان کی غریب الوطنی کی موت پر پہروں بیٹھا آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا رہا۔ جب ذرا اوسان بحال ہوئے تو پھر اپنی محسن ہستی رفعت کے تصور میں اپنا سر اس کے حضور عقیدت کے لئے جھکا دیا۔ اللہ کے کرم سے میری جان بھی بچ گئی اور اس قیامت خیز حملے میں میرا کوئی جسمانی عضو بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ واقعی اگر رفعت میری معاونت کو بروقت نہ پہنچتی تو میرا انجام بھی وہی ہوتا جو میرے ساتھیوں کا چند لمحے قبل ہوا تھا۔ بہر حال میں جہاں بھی گیا یہ چہرہ میرے ساتھ ساتھ رہا۔

موت ان کا منہ ہی تکتی رہ گئی
جو تیری فرقت کے صدمے سہہ گئے

پھر 1947ء کے پرآشوب دور کا آغاز ہوا۔ کیسے کیسے دل دوز مناظر دیکھنے کو ملے، اب انہیں یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیسے کیسے بستے گھر پل بھر میں اجڑ گئے۔ کتنی سہاگنوں کے سہاگ لٹ گئے۔ کتنی ماؤں کے لخت جگر ان کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ گئے اور یہ بے بس جیتی جاگتی آنکھیں سب کچھ دیکھتی رہیں۔ کتنے بھائی بہنوں کی عزت بچانے کے لئے اپنی جانوں پر کھیل گئے۔ اللہ اللہ کیسی قیامت تھی اور کیسا نفسا نفسی کا عالم تھا، اب بھی وہ سمے یاد آتے ہیں تو آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں۔ خیر میں بھی اپنے احباب و دیگر رفقاء کے ساتھ پاکستان ہجرت کر آیا۔ یہاں پہنچ کر نئے نئے مسئلوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر ان حالات کی تفصیل میں گیا تو ایک نیا باب کھل جائے گا۔ میرے سب رفقاء اپنے اپنے مشاغل اور مصروفیتوں میں منہمک ہو گئے لیکن مجھے ایک ہی دھن تھی کہ رفعت کو کہیں نہ کہیں تلاش کیا جائے۔ صبح ہوتی

www.ksars.org

تو میں اس مشن پر نکلتا اور شام ڈھلے ناکام و نامراد لوٹتا۔ کونسا کیمپ ہوگا جہاں میں نہ پہنچا۔ کونسا کیمپ افسر ہوگا جس سے میں نے رفعت کے متعلق نہ پوچھا ہوگا۔

باغ بہاراں پھُل ہزاراں باس لٹی ہر پاسے
کتوں نہ آئی بو سجن دی عمر گزاری آسے

لیکن میں اتنا بختوں والا کہاں تھا، مجھے رفعت کا کسی نے اتا پتا نہ دیا۔ شاید

وحشتیں کچھ اس طرح اپنا مقدر ہو گئیں
ہم جہاں پہنچے ہمارے ساتھ ویرانے گئے

آخر تھک ہار کر اور ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے رفعت کی جستجو کا مشن بادلِ نخواستہ ترک کر دیا اور روزمرہ کی مصروفیتوں میں مشغول ہو گیا۔ صوم و صلوٰۃ، درود و وظائف، تہجد کی ادائیگی میں پھر باقاعدگی آ گئی۔ اہل خانہ کی طرف سے شادی کرنے کا اصرار دن بدن بڑھ رہا تھا۔ لیکن میں ہر بار اس مشورے کو سختی سے رد کر دیتا کیونکہ،

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

بہر حال اسی تکرار اور پس و پیش میں مزید دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ میں ذاتی طور پر رفعت کی طرف سے مایوس اور ناامید ہو چکا تھا، پھر وہی تہی دامنی کی زندگی تھی۔ پھیکی پھیکی محرومیوں سے بھری، وہی خالی خالی دن رات تھے وہی گھر تھا اور وہی بے بسی۔ تصور میں رفعت کے ساتھ میں نے بھی ذہن میں ایک اپنا گھر محفوظ کیا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا گھر، صحن میں انگوروں کی بیلوں کا منڈوا اور پھولوں کی کیاریاں جن میں رنگ برنگے نازک نازک پھول کھلے ہوں گے جو ہوا کی ذرا سی جنبش پر جھوم اٹھیں۔ ننھی منی رنگین کلیاں جو شرما شرما کر دھیرے سے مسکرا پڑیں۔۔ میں انہی حسین تصورات میں گم کسی انجانی منزل کی طرف بسرعت پرواز کرتا رہا۔ آخرکار جب خوابوں اور آرزوؤں کے سارے چراغ حالات کے اندھیروں نے گل کر دیئے تو میں نے احباب کے پرزور اصرار پر شادی کا مطالبہ بادلِ نخواستہ قبول کر لیا۔

www.ksars.org

خوش قسمتی سے زندگی کا ساتھی فرشتہ صفت ملا، کچھ عرصے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو بچے دیئے اور یوں زندگی ہنسی خوشی رواں دواں ہوگئی۔

1958ء کا ذکر ہے، میں بسلسلۂ ملازمت راولپنڈی چھاؤنی میں متعین تھا۔اہل وعیال بھی میرے ساتھ تھے اور میں اپنی سرکاری رہائش گاہ پر جو ایک نہایت ہی خوب صورت مقام پر واقع تھی رہائش پذیر تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی اور سر سبز درخت لہلہاتے رہتے تھے۔کوارٹر کے باہر کافی جگہ تھی جہاں ہم نے مختلف پھول اور سبزیاں اگا رکھی تھیں جس کی وجہ سے ہمیں بازار سے سبزی خریدنے کی کم ہی نوبت آتی تھی۔ایک شب حسبِ معمول عشاء کے بعد درود و سلام کے بعد چراغ گل کر کے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ چارپائی کھڑکی کے بالکل ساتھ تھی اور حسب معمول کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ چودھویں کا چاند پوری تابانی سے آسمان پر چمک رہا تھا۔ہر چیز چاندنی سے دھل کر نکھری نکھری سی نظر آرہی تھی۔حد نظر تک قدرت کے حسن اور رعنائیوں میں بے حد اضافہ ہوگیا تھا۔ فضاؤں میں نشہ سا گھل گیا تھا کیف وسرور کا عالم تھا۔ رنگوں،امنگوں اور رعنائیوں کی بن آئی تھی۔کھڑکی کے راستے چاندنی چھن چھن کر میرے کمرے کی ہر چیز کو نقرئی بنا رہی تھی۔رات کافی بھیگ چکی تھی، باہر کی فضا میں مکمل سکوت طاری تھا۔چارپائی پہ لیٹے لیٹے میں روح کے متعلق سوچنے لگا۔ روح کیا چیز ہے؟روحانی طاقت کیسے حاصل کی جاسکتی ہے؟کیا دیکھتا ہوں کہ ایک برقع پوش خاتون میرے کمرے میں آگئی ۔حتیٰ کہ چلتے چلتے میرے پلنگ کے قریب لمحہ بھر کے لئے رک کر پائنتی کی طرف بیٹھ گئی۔ گو یہ ایک انہونی سی بات تھی لیکن کیونکہ میں ایسے واقعات کا عادی سا ہو گیا تھا لہٰذا میں مطلق نہ ڈرا اور نہ ہی خوف زدہ ہوا۔چند ثانیے کے بعد اس نے اپنے رخ سے پردہ ہٹادیا، مجھے اپنی بینائی پہ یقین ہی نہ آیا کہ میرے سامنے میری متاع حیات رفعت بیٹھی تھی۔کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ہزار جتن کے باوجود کچھ کہنے سے قاصر رہا، زبان جیسے گنگ ہوگئی ہو۔بقول فیض،

دل سے تو ہر معاملہ کرکے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی

ہم ایک دوسرے کو دیکھنے میں منہمک تھے کہ آخر رفعت نے بولنا شروع کیا۔"میں جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے بے حد و بے حساب تعلق خاطر رکھتے ہیں لیکن بادلِ نخواستہ میں آپ سے استدعا کرتی ہوں کہ آپ مجھے بھول جانے کی کوشش

www.ksars.org

کریں۔ میں خود ہی بے ثبات ہوں، فانی ہوں اور فنا ہو جانے والی چیز سے اتنا عشق کرنا دانائی نہیں۔ اگر آپ جاودانی ہونا چاہتے ہیں تو صرف اللہ تعالیٰ سے عشق کی حد تک محبت کریں اور پھر ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ آپ ابدی زندگی کا راز پا جائیں گے۔ مزید رہنمائی کے لئے کسی ''مرد خبیر'' کی جستجو کیا کریں، یقیناً مل جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ علامہ اقبال کے کلام کا باقاعدگی سے مطالعہ جاری رکھیں۔ یہ کلام آپ کو زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرے گا اور ''ام الکتاب'' کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا۔ یہی آپ چاہتے ہیں نا؟ آپ سے دور رہنا مجھے بھی گوارا نہیں لیکن میرا علیحدہ رہنا ہی آپ کے لئے بہتر ہے۔ دنیوی و معاشرتی مجبوریوں کی وجہ سے میرا جسمانی بندھن کسی دوسری جگہ ہو گیا ہے لیکن یقین جانئے آپ سے روحانی تعلق ہر وقت اور ہر لمحے رہے گا۔ میں جہاں بھی اور جس حال میں بھی ہوں گی میری روح آپ کے ساتھ ساتھ رہے گی، اب میں اجازت چاہوں گی۔'' خداحافظ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب امنڈ آیا اور مجھے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی رفعت دروازہ سے باہر نکل گئی۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس حیرت انگیز واقعے کے بعد گو رفعت سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ رفعت ہر وقت پاس ہی موجود ہوتی ہے، دن ہو یا رات،

پھیلی ہیں فضاؤں میں اس طرح تیری یادیں
جس سمت نظر اٹھی آواز تیری آئی

تمنادرد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

(اقبالؔ)

''مرد خبیر'' کی تلاش کا مرحلہ بھی ایک کٹھن اور مشکل ترین مرحلہ تھا۔ نہ کوئی تصور، نہ کوئی تصویر، نہ کوئی اتا پتا، نہ کوئی نشانی، بس اللہ کا کرم اور اس کی مدد و راہنمائی درکار تھی۔ اللہ کی کرم نوازی شامل حال رہی اور مجھے وہ راہنما مل گیا۔ میں نے اپنے مرشد پاک کے سامنے (جو اب بھی بقید حیات ہیں) زانوئے ادب سے سر جھکا دیا اور انہوں نے کمال شفقت اور

www.ksars.org

سخاوت سے علم ظاہر و باطن سے میری راہنمائی فرمائی۔اللہ کی معرفت حاصل ہوئی،جناب حضور سرور کائنات، فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے بمع اصحابؓ کا عالم ارواح میں دیدار نصیب ہوا۔بعدازاں عاشق رسول علامہ اقبال رحمۃاللہ علیہ سے عالم رویا میں ملاقات ہوئی۔ مختصراً مجھ مسکین وذرے کو وہ نصیب ہوا جس کا میں ہرگز مستحق نہ تھا،شاید میاں محمد بخشؒ کے یہ اشعار میری صحیح ترجمانی کر سکیں۔

خخس جناں قدر نہ میرا ، اس نوں سبھ وڈیائیاں
میں گلیاں دا روڑا کوڑا محل چڑھایا سائیاں
کھریاں دے لڑ لگا میں بھی کھوٹا آپ جہانوں
شالہ کھوٹ میرے نوں کجّن دائم شرم انہاں نوں
پردہ پوشی کم فقر دا کرسن اللہ بھاوے
سدا امید محمد بخشا زور دلے وچ پاوے

ایک روز بیگم کے اصرار پر حضرت داتا گنج بخش کے آستانہ عالیہ پر حاضری دینے کا موقع نصیب ہوا۔ حضور داتاؒ کے مزار اقدس کے سامنے باادب بیٹھ گیا۔یک دم دل میں خیال وارد ہوا کہ اولیاء اللہ مرتے نہیں، زندہ رہتے ہیں اور اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر مامور ہوتے ہیں پھر کیوں نہ داتا کے حضور زیارت کی درخواست پیش کی جائے۔لوگ اپنی اپنی دنیوی پریشانیاں، دکھ مصیبتیں داتا کے حضور پیش کررہے تھے کوئی کسی رنگ میں اور کوئی کسی ڈھب میں ۔میں نے بھی مؤدبانہ اپنی درخواست پیش کردی جس کا متن کچھ یوں تھا،

حضور میں آپ کے آستانہ پر اینٹوں اور پتھروں کی ایک خوش نما عمارت کو دیکھنے حاضر نہیں ہوا،ا یک خواہش لے کر آیا ہوں کہ سرکار کے دیدار نصیب ہو جائیں، مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔

میری خوش بختی کہئے کہ درخواست فوراً منظور ہوگئی اور داتا حضور نے کمال شفقت اور مہربانی سے اس عاصی کو دیدار سے فیض یاب فرمایا۔نماز مغرب میرے ساتھ ادا فرمائی اور پھر میری بچی نصرت جو میرے ساتھ ہی تھی کے گلے میں شفقت سے پھولوں کا ہار ڈالا اور پھر تشریف لے گئے۔

www.ksars.org

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں آدمی بے نظیر ہوتے ہیں
ان کی محفل میں بیٹھنے والے کتنے روشن ضمیر ہوتے ہیں

میں خود جب اپنا احتساب کرتا ہوں تو سوائے شرمندگی اور ندامت کے کچھ بھی نہیں پاتا، مجھ میں کتنے عیب ہیں، میں کتنا گناہ گار ہوں، لیکن دوسری جانب جب فیضان نظر کی طرف نگاہ ڈالتا ہوں تو اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہوں۔ مجھ ذرّے کو کسی کی نگاہ نے کیا سے کیا بنا دیا۔ واللہ، یہ کتنا بڑا انقلاب ہے۔

نظر ملا نہ سکے شہر یار بھی ان سے
تیرے فقیر بڑے ہی وقار سے گزرے

گاہے گاہے سوچتا ہوں کہ وہ پر اسرار ہستی جو رفعت کے روپ میں میری مونس و غمگسار بنی رہی ہے اور جس کی ایک خاص ادا اور راہنمائی سے میری کٹھن منزلیں خود بخود ہی سہل ہوتی رہی ہیں، وہ خود معرفت کی کس منزل پر قابض ہو گی۔ اس منزل میں اس کا اپنا مقام کیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اسے ان وارداتوں کا بالکل علم ہی نہ ہو اور اس کی روح یہ سب کام سرانجام دے رہی ہو۔ لیکن وہ پھر کہاں چھپ گئی۔ وہ کس حال میں ہے؟ دل میں ایک خلش ہے ایک تشنگی ہے کہ جاتی ہی نہیں! خلش یہ کہ۔۔ میں اسے سنا کے روؤں اور وہ مجھے سنا کے روئے۔ جو کچھ مجھ پہ بیتی ہے میں وہ اسے سب ہی کچھ تو سنانا چاہتا ہوں پہروں بیٹھ کر۔۔

ایک حقیقی راز جسے میں مدتوں سے اپنے سینے میں چھپائے پھر رہا ہوں۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے ہر طرف سے ناامید ہو کر قلم کا سہارا لیا ہے کہ شاید یہ تحریر میری اس محسن و غم گسار ہستی کی نظر سے گزرے جسے تلاش کرتے کرتے اتنا تھک گیا ہوں کہ اب انجام قریب ہے۔

میں روسیاہ مسکین دعا ہی کر سکتا ہوں کہ یا اللہ میرے اس دور افتادہ خیر خواہ ہمدم و ندیم کو دونوں جہانوں کی خوشیوں اور مسرتوں سے نواز دے کہ یہی میری متاع کائنات ہے۔

آمین۔ آمین

www.ksars.org

سعیدہ خاتون عظیمی

معرفت عشق

کچے صحن میں گائے رسی سے بندھی ہوئی تھی۔اس کا بچہ بھی پاس ہی ماں کے آس پاس گھوم رہا تھا کبھی وہ ماں کی ٹانگوں کے قریب آجاتا تو ماں اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی۔اور اپنی گیلی زبان سے اسے اس طرح چاٹتی جیسے لعاب دہن نہیں محبت کی چاشنی اس کے بدن پر مل رہی ہے۔اتنے میں گوالا آیا، بچے کو ماں سے دور لے جانے کے لئے ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ممتا کی ندی میں جیسے طوفان آگیا۔زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتی ہوئی، گوالے کی جانب اس طرح بڑھی کہ کچی زمین میں گڑا ہوا کھونٹا اکھڑ گیا۔گوالا اپنی جان بچانے کے لئے بچے کی رسی چھوڑ بھاگ کھڑا ہوا۔ماں اپنے بچے پر جھک کر پھر اسے پیار سے چاٹنے لگی، ایک لمحے پہلے کی گائے میں اور اس لمحے کی گائے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔وہ خونخوار درندہ تھی۔یہ بے ضرر چوپایہ۔اے ممتا یہ رخ دونوں تیرے ہی ہیں۔

سردیوں کی ایک خوش گوار صبح تھی ۔ سورج کی سنہری کرنوں میں خوب صورت موزیک کا فرش موتی کی طرح چمکنے لگا۔ماں اپنے ننھے منے کے ساتھ برآمدے میں نکل آئی۔اس کے ہاتھ میں چاول بھری تھالی تھی۔دیکھو منے، میں اتنے چاول چن لوں۔تم یہاں دھوپ میں کھیلو۔چاول چنتے ہوئے وہ بار بار کنکھیوں سے بچے کو دیکھتی، مسکراتی نظروں میں بچے کی محبت سمندر کی گہرائیوں سے بھی سوا دکھائی دیتی۔معصوم جان ماں کی محبت کے گہرے سمندر میں ایک موج کی طرح اس کی رگ جان سے ٹکراتا۔کبھی آڑے ترچھے قدموں سے دوڑتا ہوا آکر ماں کی گردن سے لپٹ جاتا اور کبھی ہنستا ہوا ماں کے سینے سے اس طرح آکر ٹکراتا کہ چاول کی تھالی اس کے ہاتھ سے گرنے لگتی۔منے کہہ کر وہ اس کے گال کو چوم کر اسے پھر پرے کر دیتی اور دوبارہ چاول چننے لگ جاتی۔اتنے میں ایک زور کی چیخ ابھری، ماں کے ہاتھ سے چاول کی تھالی چھوٹ گئی وہ بجلی کی سی تیزی سے بچے کی طرف لپکی، اس کا منا فرش پر گرپڑا تھا۔اس نے دیوانہ وار اسے اپنی چھاتی سے لگالیا

www.ksars.org

اور فرش کو ہاتھوں سے مارنے لگی۔ نہ رو منے، اس فرش سے تمہیں چوٹ لگی ہے۔ میں اسے بہت ماروں گی۔ بچے نے آنسو بھری آنکھوں سے فرش کی طرف دیکھا جسے اس کی ماں ایک ہاتھ سے مار رہی تھی۔ اس کے ننھے منے دل کو جیسے قرار آگیا، چیخیں بند ہو گئیں۔ اگلے ہی لمحے میں وہ ماں کے سینے میں منہ چھپائے گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ ماں سینے سے بھینچے اس کے بال چومتی رہی۔ اسے اس کی پروانہ تھی کہ چاول سارے برآمدے میں بکھرے ہوئے ہیں اس کی پیار بھری نظریں تو بس اپنے لعل پر تھیں۔ جس کی چوٹ کا اثر ابھی تک اس کے دل میں محسوس ہو رہا تھا۔

اے محبت یہ بھی تیرا ہی ایک روپ ہے اور وہ شباب کی رعنائیوں سے بھرپور قدرت کا ایک حسین مرقع تھی۔ بھنورا نہ ہو تو کلی کے رنگ کو ن پہچانے، بہار نہ ہو تو چمن پر نکھار کیسے آئے عشق نہ ہو تو حسن کی قیمت کون چکائے۔ اے حسین دوشیزہ تیرا مہر حجلۂ عروسی کا وہ انمول لحہ ہے جس لمحے دل ملتے ہیں۔

شبِ وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ ذرا
ترے شباب کی معصومیت نکھر آئی

گھٹائیں مسکرانے لگیں، ہوائیں گنگنانے لگیں، سارا عالم حسن کے نور میں ڈوب گیا۔ خوشیوں کے پیمانے چھلکتے رہے، حسن عشق کی آغوش میں دنیا و مافیہا کی ہر شے سے غافل ہو گیا۔

شبانِ ہجرت درازچوں زلف و روزِ وصلت چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

کہاں وہ وصل کی روشن گھڑیاں، کہاں یہ کالے ناگوں جیسی ہجر کی لمبی راتیں۔ کہاں وہ بہار کی رنگیں خوش بوئیں، کہاں یہ خزاں کے ویران سناٹے۔ کہاں وہ نور برساتا ہوا جمال، کہاں یہ حسرتوں سے بھرپور بے نور آنکھیں۔ اے محبوب! تیری جدائی میں یہ حسن سوگوار ہے۔ شباب کی رعنائیوں پر موت کے سائے منڈلاتے ہیں۔ جوانی کے رنگ پت جھڑ کے جھونکوں میں اڑے جاتے ہیں۔ محبت کی داستان اب قصۂ پارینہ میں بدل چکی ہے۔ محبت کے نغمے اب درد کی آہوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ کوئی تو اس سے کہہ دے یہ جا کر، محبت کی یہ تصویر تو تُو نے دیکھی ہی نہیں۔

www.ksars.org

دن بھر کے عطیات وہدایہ تقسیم کردینے کے بعد لوگوں سے فارغ ہو کر محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اپنے حجرے میں مراقب تھے۔ اتنے میں ایک خستہ حال، صورت سے پُر ملال شخص اندر آیا۔ حضور! میری تین بیٹیاں شادی کے لائق ہیں اوران کو کھلانے کا سامان بھی نہیں ہے۔ کجا جہیز اور شادی کے انتظام کا بندوبست۔ کیا کروں، کہاں سے کروں، مجبوری ولاچاری آپ کے در تک لے آئی ہے۔ بے بس باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر محبوب الٰہیؒ کا دل تڑپ اٹھا۔ حجرے میں چاروں طرف نظر ڈالی کہ کوئی شے ہو تواس کی نذر کروں۔ مگر وہ تو پہلے ہی لوگوں کو بانٹ کر فراغت حاصل کر چکے تھے۔ نہیں نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے کہ کوئی سوالی اس کے دوست کے در پر دستِ سوال دراز کرے اور وہ خالی لوٹایا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ سامنے اپنی جوتی کی جوڑی دکھائی دی، بے قراری میں وہی اٹھالی۔ اوراس شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے محبت سے کہنے لگے۔ اسے لے جااور تجھے بازار میں کچھ لوگ ملیں گے۔ ان سے کہنا، کہ یہ جوتے نظام الدین (اولیاء) کے ہیں۔ جو زیادہ قیمت دے ان کے ہاتھ بیچ کر اپنا کام چلا۔ وہ آدمی ٹوٹے دل سے جوتے لے کر اٹھا۔ سوچنے لگا، غریب دیکھ کر شاید ٹال دیا گیا ہے۔ چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا ہی بہتر ہے۔ کچھ نہیں تو ایک وقت کا دال دلیا ہی مہیا ہو جائے گا۔ یہی سوچتے سوچتے بازار میں نکل آیا۔ لوگوں پر نظر پڑی تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی بات یاد آئی۔ اس نے زور زور سے آوازیں لگانی شروع کر دیں۔ یہ جوتے حضرت خواجہ کے ہیں۔ کوئی انہیں قیمت دے کر خرید لے۔ لوگ اس غریب پر ایک تمسخرانہ نگاہ ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔ کوئی بھی ان پرانے جوتوں کی قیمت دینے والا نہ تھا۔ اتنے میں سامنے سے حضرت امیر خسرو آتے دکھائی دیئے۔ ان کے کانوں میں اپنے پیرو مرشد کا نام پڑا تو لپک کر اس آدمی کے سر پر جا پہنچے۔

حضرت امیر خسرو کا تعلق شاہ ہند کے دربار سے تھا۔ اور آپ اس وقت اسی کے دربار سے آرہے تھے۔ مرشد کریم کا نام سن کر فرطِ محبت سے تڑپ اٹھے۔ کیا کہا تو نے یہ جوتے خواجہ پیا کے ہیں۔ ارے او ہفت اقلیم کے شہنشاہ! تو اس انمول خزانے کی قیمت سے بھی واقف نہیں ہے۔ کیا چاہئے تجھے اس کے عوض، اس کی قیمت میں تو ساتوں آسمان اور زمین بھی کم ہیں۔ اس انمول تحفے کو کون خریدنے کی سکت رکھ سکتا ہے۔ ارے او نادان! تو انہیں پیسوں کے عوض دیتا ہے۔ لے یہ لے جا، اور جوتے مجھے دے دے۔ کاش میرے پاس اس وقت کچھ اور بھی ہوتا تو وہ بھی دے دیتا اس انمول خزانے کے عوض،

www.ksars.org

یہ کہہ کر دربارِ ہند کی جانب سے عطا کردہ اشرفیوں کی ایک تھیلی اس کو پیش کر دی۔ اور بھی جو کچھ قیمتی شے پاس تھی وہ سب کچھ دے دیا اور نہایت ہی احترام اور بصد شوق و جذبہ عشق مرشد کے آپ کی جوتیاں سر پر رکھ لیں۔ جوتیوں کا سر پر رکھنا تھا کہ عشق کی آگ تن بدن میں سرایت کرنے لگی۔ جذب و مستی میں بے خود ہو کر دربارِ نظام الدین اولیاءؒ میں جا پہنچے ۔ دربار کے تمام لوگ نظر سے اوجھل ہو گئے، نگاہیں خواجہ پیا پر لگی تھی۔ بھرے دربار میں جوتیاں سر پر رکھے مستی میں ناچنے لگے۔۔۔

چھاپ تلک سب چھین لی رے مو سے نیناں ملائیکے
اپنی سی رنگ لی نی رے مو سے نیناں ملائیکے

اور لوگوں نے دیکھا کہ شیخ کی جوتیوں نے مرید کو فنافی الشیخ کر دیا۔ عشق کی یہ بھی ایک ادا ہے۔

سبحان اللہ ! کیا شان ہے ان متبرک ہستیوں کی جنھوں نے صوف کے جبّے پہن کر بکریاں چرائیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے آٹھ آٹھ پہر کے روزے رکھے۔ آپ ایک ایسی ہی بابرکت ہستی ہیں جن کے لئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی میں یمن کی جانب رخ کرتا ہوں مجھے اُدھر سے محبت کی خوشبو آتی ہے۔ فنائے عشقِ رسولؐ عطائے دست قبول جناب حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ، اللہ اور اللہ کے پیارے رسولؐ کا ان پر سلام ہو۔ آپ کی والدہ ماجدہ نہایت ہی ضعیف اور معذور تھیں۔ سوائے حضرت اویس قرنی کے ان کا اور کوئی نہ تھا جو انکی دیکھ بھال کرتا۔ یہ زمانہ حضور پاکؐ کی رسالت کا زمانہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کے خدمت کے صلہ میں حضرت اویس قرنی کے قلبِ پاکیزہ میں اپنے محبوبؐ کی محبت کا نور بھر دیا۔ حضرت اویس قرنی اپنے ہاتھوں سے ماں کو نوالے بنا کر کھلاتے۔ اس کے لئے بکریاں چراتے۔ ادھر فرائض کی بیڑیاں پاؤں میں بندھی تھیں، ادھر قلب مبارک میں عشقِ محمدیؐ نے زور پکڑا ہوا تھا۔ نظر کا تقاضا کہ دیدار رسولؐ سے روشنی حاصل ہو جائے۔ اور معذور ماں کے رحم کی پکار کہ میری محتاجی کا سہارا نہ چھینا جائے۔ دونوں کو نبھانا بڑے حوصلے کے بات ہے اور یہ حوصلے بھی دنیا نے دیکھ لئے۔ ماں کی آخری سانس تک اس کی خدمت میں لگے رہے۔ اور ادھر دل ہی دل میں عشق رسولؐ کی ایسی پرورش کی کہ یہ بوٹا ایک مضبوط تناور درخت بن گیا۔ جس کی جڑیں حضرت اویس قرنی کی رگ جان میں پیوست ہو گئیں۔ جنگ احد میں جب دشمنان اسلام نے اللہ کے محبوبؐ کے دندان مبارک شہید

www.ksars.org

کر ڈالے تو حضرت اویس قرنیؓ کے سمندرِ عشق میں طوفان آگیا۔ درد کی لہر قلب سے اٹھتی اور ایک ایک دانت کو اکھیڑ کر پھینک دیتی جب تک اپنے سارے دانت خود اپنے ہاتھوں سے نہ اکھیڑ ڈالے، درد عشق تھم نہ سکا۔ عشق محمدیؐ میں فنائیت کی یہ مثال بھی کیسی عجیب مثال ہے۔

ہزاروں درود اور ہزاروں سلام ہوں اللہ تعالیٰ کے اس نور پر جس کو اللہ نے اپنا محبوب کہہ کر پکارا، جنہیں باعثِ تخلیقِ کائنات ٹھہرایا، جنہیں رحمت للعالمین بنایا، جنہیں مقام محمود تک پہنچایا، جن کو اپنی قدرت کی عظیم ترین نشانیوں سے نوازا۔ عشق باری تعالیٰ میں ڈوبی ہوئی اس ذاتؐ کو ہر طرف سے اللہ نے گھیرا ہوا ہے۔ کس کی مجال ہے کہ اسے بری نظر سے کوئی دیکھ تو لے۔ اور جب یہ نور محمدی آسمان سے زمین پر جلوہ گر ہوا تو قدرت اس کی حفاظت کے لئے اور زیادہ مستعد ہوگئی۔ جس نے بھی اللہ تعالیٰ کے محبوبؐ پر بری نظر ڈالی اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے پھوڑ دی گئیں۔ جس نے بھی اللہ کے رسولؐ کی شان میں گستاخی کی اس کی قیمت میں ابد تک کے لئے اس گستاخی کی پاداش میں تڑپنا لکھ دیا گیا۔ جس نے بھی اللہ کے پیارے کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کی، قدرت کا جذبۂ انتقام بھڑک اٹھا۔ صفت عشقِ دل سے صدا بلند ہوئی، تبت یدا ـــــ

ترجمہ: ٹوٹ جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ وبرباد ہوگیا۔ کوئی فائدہ نہ پہنچایا اسے اس کے مال نے اور جو اس نے کمایا۔ عنقریب وہ جھونکا جائے گاشعلوں والی آگ میں۔ اور اس کی بیوی بھی بد بخت ایندھن اٹھانے والی ۔اس کے گلے میں مونج کی رسی ہوگی۔

بدبخت ابولہب حضور پاکؐ کا چچا تھا۔ اس کی بیوی اور وہ حضور پاکؐ کے راستے میں خار دار جھاڑیاں بچھا دیا کرتے تھے۔ نگاہِ عشق اپنے محبوبؐ کے پائے نازک کی خراش نہ دیکھ سکی۔ عرش سے فرش تک اور فرش سے عرش تک ملک خداوندی میں تہلکہ مچ گیا۔ وہ بدبخت آخر کہاں بچ کر جائیں گے دست قدرت کی رسائی سے۔ ان سے کہہ دو کہ قدرت کی زمین پر وہ جہاں جہاں سے گزریں گے، ان کے لئے سوائے تباہی و بربادی کے کچھ نہ ملے گا۔ یہ کیسا عشق ہے کہ خود قدرت اپنے محبوبؐ کے دشمن سے انتقام پر اتر آئی ہے۔ یہ کیسا عشق ہے کہ اپنے محبوبؐ کو گزند پہنچانے والے کے لئے اللہ کے کلام سے بد دعائیں نکلتی ہیں۔ اے نادان، یہ عشق کی انتہا ہے۔ ذات محمدیؐ فنا فی اللہ ہے جیسے جسم اور جان کا رشتہ۔ جسم ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اور جان ذات باری تعالیٰ کی تجلی ہے۔ جسم کے روئیں روئیں میں جان پیوست ہے۔ ایک

www.ksars.org

روئیں کو کھینچا جائے تو تمام جان میں تکلیف ہوتی ہے۔ ہر رُواں درد کی ٹیس سے تڑپ اٹھتا ہے۔ جسم کی ہر تکلیف کا اثر جان کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔ جان تو اصلِ ذات ہے، اصلِ ذات وحدتِ خداوندی ہے جس کی ہر صفت لا محدود ہے۔ ارے او بیوقوف! دنیا کے نشے میں ڈوبے ہوئے انسان! کبھی بھول کر بھی ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹیڑھی نظر نہ ڈالنا۔ کہ یہ اللہ کی حدود میں داخل ہونے کی ناکام کوشش ہے۔ کوئی ناپاک اس پاک ہستی کے قریب بھی جانے کی جرات نہیں کر سکتا۔

جان لو کہ معرفت عشق کی حقیقت خود ذات ہے۔ جب جسم اور جان آپ میں ملتے ہیں تو عشق کی معراج ہوتی ہے۔ جب روح اور ذات آپس میں ملتے ہیں تو کائنات حرکت میں آجاتی ہے۔ روح ذات کا وہ آئینہ ہے جس میں نظر خداوندی اپنی شانوں کو دیکھتی ہے۔ ذات کی ہر صفت وحدت ہے۔ ذات سے نکلی ہوئی یہ روح بھی وحدت خداوندی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہی روح یہی نادر نمونہ ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو ذات باری تعالیٰ کا آئینہ ہے۔

ایک اللہ کے بندے موت کا ذکر بہت محبت وشوق کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ میاں لوگوں کو تو موت کے نام سے ہول چڑھتا ہے اور آپ ہیں کہ ہر وقت موت کی تمنا میں جیتے ہیں۔ کہنے لگے، دراصل موت کی خواہش بھی اللہ ہی کے لئے ہے کہ میرے دل میں اللہ تعالیٰ سے ملنے کا اس قدر شوق وجذبہ ہے کہ موت مجھے ایک ایسا پُل دکھائی دیتی ہے جس پُل پر چل کر میں اپنے رب سے ملاقات کروں گا۔ پس میرا جی چاہتا ہے، کسی طرح وہ پُل میرے سامنے آجائے۔ اور میں اس پُل پر چل کر اپنے رب کی آغوش میں داخل ہو جاؤں۔ یہ پُل مجھے اسی لئے عزیز ہے کہ یہ مجھے میرے محبوب سے ملانے والا ہے۔

یہ بھی عشق کا ایک نرالا انداز ہے۔ مجنوں جس ویرانے سے گزر کر درِ لیلیٰ تک پہنچتا ہے، وہ ویرانہ بھی درِ لیلیٰ کی طرح عزیز ہو جاتا ہے۔ معرفت عشق میں تمام حقیقتیں آئینۂ محمدیؐ میں جا کر گم ہو جاتی ہیں۔ کسی کی نظر آئینہ کو دیکھتی ہے اور کسی کی نظر آئینے کے اندر جلوۂ خداوندی کی مشاہدہ کرتی ہے۔ آئینہ نہ ہوتا تو جلوے بھی نہ ہوتے۔ آئینے کے حجابات ہی جلوے کی نمود ہے۔ عشق حجابات کے پردے میں داخل ہو کر خود حجاب ہو جاتا ہے اور اس کی معرفت لا محدود ہو جاتی ہے کہ حجابات

www.ksars.org

کے بعد ذات کی ہر فکر لا محدودیت میں داخل ہو جاتی ہے۔ عشق کی معرفت لا محدود ہے اور لا محدودیت صفت باری تعالیٰ ہے۔ عشق ذات باری تعالیٰ کی ایک ایسی صفت ہے جو روح کو ذات کی جانب کھینچ رہی ہے۔ ذات کی اسی کشش کا نام عشق ہے۔ روح کے اندر اس کشش کا ادراک اور احساس عشق کی کیفیات ہیں۔

www.ksars.org

ماخوذ از 'ایک سو ایک اولیاء اللہ خواتین'

کوئل

محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے عاشقوں میں ایک عاشق زنخا ''کوئل'' بھی تھا۔ گاؤں میں اس کا کچا گھر تھا۔ آپ کی یاد میں گم رہتا تھا اور کبھی کبھی پیروں میں گھنگرو باندھ کر ناچنے اور گانے لگتا تھا، اس کی جادو بھری آواز فضا کو مسحور کر دیتی تھی۔ سریلی آواز کی وجہ سے لوگ اسے کوئل پکارتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک پیر صاحب اپنے بہت سارے مریدوں کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر حاضری کے لئے جا رہے تھے، پیر صاحب کی سواری گاؤں سے گزری تو ایک کچے مکان سے گانے کی آواز آئی، مکان کے قریب پہنچے تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور صحن میں کوئل رقص طاؤس میں محو تھا، گانے میں اتنا سحر تھا کہ پیر صاحب صحن میں جا کر گانا سننے لگے، کچھ دیر کے بعد خیال آیا کہ گانا سننا ناجائز ہے، ان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی اور واپس ہونے لگے تو کوئل ان کے قریب آیا اور بہت ادب سے عرض کیا:

''اے ہے میاں! مجھ گنہگار کی ایسی قسمت کہاں کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں۔''

پیر صاحب نے غصے سے کہا:

''خاموش! ہم محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضری دینے جا رہے ہیں، یہاں گانے کی آواز سن کر ہم دیکھنے کے لئے رک گئے کہ کون گا رہا ہے۔''

پیر صاحب نے سوچا کہ کچھ دیئے بغیر چلے جانا وضع داری کے خلاف ہے چنانچہ انہوں نے ایک روپے کا سکہ نکال کر کوئل کی طرف بڑھا دیا۔ کوئل نے روپیہ لے کر دوبارہ پیر صاحب کی طرف بڑھا دیا اور کہا:

www.ksars.org

’’میاں جی! یہ ایک روپیہ خواجہ محبوب الٰہی کی نذر کر دینا، مزار شریف پر جا کر کہنا، تمہاری کوئل نے نذرانہ بھیجا ہے، مزار شریف سے ہاتھ باہر آئے تو نذر دینا ورنہ کہیں اور خرچ کر دینا۔‘‘

پیر صاحب کو روپیہ لینے میں ہچکچاہٹ ہوئی، کوئل نے کہا:

’’میاں جی! پریشان نہ ہوں یہ روپیہ آپ کی پاک کمائی ہے، لے لیں مجھ نگوڑی کے پاس کیا رکھا ہے۔‘‘

پیر صاحب نے روپیہ رکھ لیا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر حاضری کے بعد انہیں کوئل کی نذر کا خیال آیا۔ پہلے شش و پنج میں رہے کہ نذر پیش کریں یا نہ کریں لیکن پھر روپیہ نکال کر کہا:

’’حضور یہ کوئل کی نذر ہے‘‘

اسی وقت مزار میں سے ہاتھ باہر نکلا—پیر صاحب نے روپیہ ہتھیلی پر رکھ دیا، مٹھی بند ہوئی اور جس طرح قبر سے ہاتھ باہر آیا تھا اسی طرح قبر کے اندر غائب ہو گیا۔

یہ منظر دیکھ کر پیر صاحب پر اضطراب طاری ہو گیا اور بے تحاشا رونے لگے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی نظروں میں کوئل کا مقام دیکھ کر وہ سخت نادم و پشیماں ہوئے۔ اسی کیفیت میں تھے کہ ان پر غنودگی طاری ہو گئی، انہوں نے دیکھا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ غریب نوازؒ اور سلطان الہند حضرت معین الدین چشتیؒ سفید چاندنی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور درمیان میں کوئل رقص کرتا ہوا نغمہ سرا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خوش ہو کر حضرت غریب نوازؒ سے فرمایا:

’’حضور! آپ نے ہماری کوئل کو دیکھا؟‘‘

حضرت خواجہ غریب نوازؒ مسکرائے اور خوشنودی کا اظہار کیا۔

www.ksars.org

پیر صاحب کی آنکھ کھل گئی، ظاہر بینی کا خول ان پر سے اتر چکا تھا۔ وہ فوراً اٹھے اور گرتے پڑتے کوئل کے گھر پہنچے۔ اپنی دستار پھینک دی اور کوئل کے پیر پکڑ لئے، کوئل نے پیر کھینچتے ہوئے کہا:

’’اے میاں جی! کیا کرتے ہو مجھ گندگی سے کیوں اپنے ہاتھ ناپاک کرتے ہو۔‘‘

کوئل کے بہت کہنے سننے کے باوجود بھی پیر صاحب نے اس کے پیر نہ چھوڑے۔ کوئل کے پوچھنے پر انہوں نے سارا واقعہ بتایا تو کوئل کی عجیب حالت ہوگئی، وہ دیوانہ وار اٹھا اور رقص کرتے ہوئے گانے لگا، وہ جھوم جھوم کر گاتے گاتے ایک دم فرش پر گرا، پیر صاحب قریب پہنچے تو کوئل کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

www.ksars.org

سہیل احمد

حافظ پیاری

کارخانۂ قدرت میں کشش اور گریز کا ایک عجیب کرشمہ برسرِ عمل ہے۔ کسی بھی حرکت کی گہرائی میں جائیے تو کشش کی قوت یا گریز کا عمل کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جسے گریز کہتے ہیں وہ بھی کشش کے ساتھ پیوستہ ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات کے اندر کام کرنے والے تمام معاملات کشش کی ان دیکھی قوت پر قائم ہیں۔ بطخ کا بچہ پیدا ہوتے ہی پانی کی طرف لپکتا ہے۔ بکری گھاس کی طرف دوڑتی ہے۔ کبوتر کبوتر کے غول میں پرواز کرتا ہے اور باز باز کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ ہر نوع کا نر مادہ کی جانب ایک نامعلوم طاقت کے زیرِ اثر کھنچتا چلا جاتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مادے کے سب سے چھوٹے جزو ایٹم میں بھی ذرّات کشش کے ایک نظام کے تحت آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔

کشش کی یہ عجیب و غریب قوت دراصل خالق کائنات کی ایک صفت ہے جو تمام مخلوقات کے اندر کارفرما ہے۔ یہ قوت بندے اور خالق کے درمیان ایک ربط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر جب یہ قوت رونما ہوتی ہے تو ان کا شعور عالم قدس کی طرف صعود کرکے اللہ تعالیٰ کی صفات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ خاصانِ خدا کی نظر میں کشش کے تمام کرشمے مجاز ہیں۔ مجاز میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ مجاز فنا ہے لیکن مجاز جس حقیقت پر قائم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو لافانی ہے اور اسی صفت سے تمام مجازی کرشمے متحرک رہتے ہیں۔ عشقِ حقیقی اس خدائی صفت کا دیوانہ ہوتا ہے اور اس کی نظر مجاز سے ہٹ کر حقیقت پر ہوتی ہے۔

انسانی زندگی خیالات پر رواں دواں ہے۔ زندگی کی تمام حرکات خیالات سے شروع ہوتی ہیں۔ جس نقطے پر خیال مرکوز ہو جاتا ہے وہ مظہر بن جاتا ہے۔ اولیاء اللہ علمِ خیال کے ماہر ہوتے ہیں۔ انہیں خیالات کو پڑھنے، خیالات کو منتقل کرنے اور

www.ksars.org

خیالات کو تبدیل کرنے میں یدِ طولی حاصل ہوتا ہے۔اہل اللہ جب اپنے شاگردوں کی روحانی تربیت فرماتے ہیں تو انسانی طبیعت اور بشری خصائل ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ شاگرد کو جو کشش مجازی میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے اس طرح کششِ حقیقی کا مشاہدہ کراتے ہیں کہ عشق مجازی عشق حقیقی میں بدل جاتا ہے۔

اس ضمن میں ہم جس واقعے کو بیان کرنے جا رہے ہیں اس کی کئی باتیں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔اس واقعے کی تفصیلات بھی زیادہ ہیں، اس میں دلچسپ مسائل بھی آتے ہیں۔ سادگی اور جذبات بھی اس میں موجود ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس واقعے کو خود اس کے مرکزی کردار نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

یہ واقعہ حاجی وارث علی شاہؒ کے ایک شاگرد سے تعلق رکھتا ہے۔ حاجی وارث علی اولیاء اللہ میں بڑے صاحبِ حال و مقام بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کی پیدائش کی خبر پہلے سے کئی بزرگوں نے دے دی تھی۔ یوپی، بھارت میں پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے طبیعت میں استغناء و توکل حد درجہ غالب تھا۔ دس برس کی عمر میں سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی اور اپنے پیرو مرشد کے حکم پر مختلف ممالک کی سیر کی۔ نسبت اویسیہ کے تحت بہت سے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ کے اوپر نست عشق کا غلبہ رہتا تھا۔ حج پر تشریف لے گئے تو احرام پہننے کے بعد کوئی اور کپڑا نہیں پہنا، ہمیشہ احرام کو زیب تن رکھتے تھے۔ لوگ بطور خدمت آپ کو احرام پیش کرتے تھے اور آپ کے نام کے ساتھ حاجی کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کے مزاج و عادات میں حضرت عیسیٰؑ کی جھلک ملتی تھی۔ آپ کا قیام زیادہ تر یوپی کے شہر دیوا میں رہتا تھا۔1904ء میں وصال فرمایا۔ آپ سے تعلق رکھنے والے لوگ وارثی کہلاتے ہیں۔

ایک مرتبہ حاجی وارث علیؒ کی خدمت میں پندرہ سولہ برس کا ایک لڑکا حاضر ہوا۔اس لڑکے کا نام عبدالکریم تھا اور لکھنؤ کے کسی مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ لوگ اس کو حافظ عبدالکریم کہتے تھے۔ حاجی صاحب نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور فرمایا "عاشق آیا، عاشق آیا۔" حافظ عبدالکریم نے بیعت کی درخواست کی، جسے حاجی صاحب نے فوراً قبول فرمالیا۔

کچھ عرصہ بعد حافظ عبدالکریم حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے حافظ کو ایک کتاب دی اور فرمایا، اس کتاب کو روزانہ دو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ انہوں نے حافظ کو شیرینی بھی دی۔ حافظ اس التفات سے بہت خوش ہوا۔

www.ksars.org

اس کتاب میں ایک کہانی تھی جس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا کہ ایک امیر کو کسی رئیس کی لڑکی سے عشق ہو گیا۔اس معاملے میں اسے بہت سے مصائب و تکالیف سامنا کرنا پڑا اور وہ رات دن لڑکی کے گھر کے چکر کاٹنے لگا۔ برسوں اس کی یہی حالت رہی۔ اچانک اس کی ملاقات کسی درویش سے ہوئی اور وہ سکون کی حالت میں ایک جگہ بیٹھ گیا اور فقیرانہ حالت اختیار کر لی۔لڑکی کو اس تبدیلی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، وہ اپنے مکان سے اس شخص کے پاس آئی تاکہ وجہ دریافت کرے۔ جواب میں عاشق امیر نے نہ جانے کیا کہا کہ وہ بھی گوشہ نشین ہو کر فقیر مشرب ہو گئی۔

دیوا میں حافظ کے رشتے کے چچا رہتے تھے۔ حافظ عبدالکریم خوشی خوشی یہ کتاب لے کر چچا کے مکان پر پہنچا اور سب کو بتایا کہ آج حاجی صاحب نے مجھے شیرینی کے ساتھ یہ کتاب مرحمت فرمائی ہے اور کہا ہے کہ روزانہ اسے دو مرتبہ پڑھا کر۔ تمام اہل خانہ کو اشتیاق ہوا اور انہوں نے کتاب سننے کی فرمائش کی، حافظ نے کتاب سنائی اور پھر روزانہ اسے پڑھنے لگا۔

حافظ عبدالکریم کی چچی نے ایک روز کہا، بچیاں بڑی ہو گئی ہیں اور باہر کے کسی شخص سے قرآن شریف پڑھوانا مناسب نہیں ہے۔ تم گھر کے لڑکے ہو، انہیں قرآن شریف پڑھا دیا کرو۔ چچا کی لڑکیوں میں ایک لڑکی تیسرا پارہ پڑھتی تھی اور اسے سب پیاری کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ حافظ کی بے شعوری کا زمانہ تھا لیکن اسے قرآن پڑھانے میں ایک خاص لطف آتا تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ پیاری قرآن شریف پڑھتی رہے اور وہ سنتا رہے۔ پیاری یہ چاہتی تھی کہ حافظ وہ کتاب جو اسے حاجی صاحب نے عطا کی تھی، پڑھتا رہے اور وہ سنتی رہے۔

حافظ عبدالکریم نے کچھ عرصہ یہاں قیام کیا اور پھر اپنے موضع بڑا گاؤں چلا گیا۔ چند روز بعد حافظ کی بہن کی شادی طے ہو گئی اور سب اعزا و اقارب جمع ہوئے۔ چچا صاحب بھی مع اہل خانہ تشریف لائے۔ تقریب کے خاتمے پر سب نے جانے کا قصد کیا تو چچی صاحبہ اور اہل خانہ کو حافظ کے والدین نے روکنا چاہا۔ چچی صاحبہ نے کہا کہ میرا رُکنا تو ممکن نہیں ہے لیکن لڑکیوں کو اس شرط پر چھوڑ سکتی ہوں کہ حافظ عبدالکریم قرآن شریف پڑھایا کریں۔ حافظ کی والدہ نے فوراً کہا، وہ تمہارا ہی لڑکا ہے بسر و چشم کلام پاک پڑھائے گا۔ حافظ نے نہایت جانفشانی سے کلام مجید پڑھانا شروع کیا اور بہت جلد ختم کرا دیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حافظ عبدالکریم کی وارفتگی و شیفتگی میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ وہ چاہتا کہ ہر

www.ksars.org

وقت پیاری کی صورت اس کے سامنے رہے اور وہ قرآن شریف پڑھاتا رہے۔ حافظ کے یہ جذبات چھپے نہ رہ سکے۔ لوگوں نے سامنے تو کچھ نہ کہا لیکن مخفی طریقے سے پیاری کے والدین کو اس بات کی خبر کر دی۔ ایک روز اچانک کہار سواری لے کر آ پہنچے، یہ وقت حافظ پر قیامت سے کم نہ تھا۔ پیاری سے جدائی کا خیال اس کے دل پر نشتر کا کام کر رہا تھا۔ پیاری کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ تمام خواتین دونوں کی حالت دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئیں۔ پیاری نے حافظ عبدالکریم سے کہا آپ دیوا شریف کب آئیں گے۔ حافظ نے بے قرار ہو کر کہا تمہارے جانے کے بعد میں پہنچوں گا۔

حافظ عبدالکریم اگلے ہی روز دیوا شریف پہنچ گیا۔ حافظ اور پیاری کے درمیان پہلے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ قرآن مجید ختم ہونے کا تذکرہ اپنی والدہ سے نہ کرے بلکہ یہ کہے کہ ابھی کچھ پارے باقی ہیں۔ پیاری نے یہ بات حافظ کے پہنچنے پر اپنی والدہ کو بتائی تو حافظ نے کہا، میں روز آ کر پڑھا دیا کروں گا۔ چچی نے حیرانی سے کہا، اپنے گاؤں سے یہاں اتنی دور آ کر تم کیسے پڑھاؤ گے، لوگ کیا کہیں گے۔ حافظ نے کہا، مجھے کوئی مشکل نہیں ہو گی اور لوگوں سے کیا مطلب۔ اللہ تعالیٰ دلوں اور نیتوں کا دیکھنے والا ہے۔

حافظ عبدالکریم روزانہ بعد نماز مغرب اپنے گھر سے چلتا اور نو بجے تک دیوا شریف پہنچ جاتا پھر قرآن مجید پڑھاتا۔ جب رات کچھ باقی رہتی تو وہاں سے اپنے گھر کی طرف چل پڑتا اور نماز فجر گھر پر ادا کرتا تھا۔ دو ڈھائی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اب دیوا شریف کے لوگوں میں اس بات پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ پیاری کے والد عبدالرؤف ریاست جہانگیر آباد میں ملازم تھے۔ وہاں سے گھر آئے اور سخت تاکید کہ حافظ عبدالکریم ہمارے گھر نہ آئے۔ اس رات حافظ قرآن پڑھانے پہنچا تو اسے منع کر دیا گیا۔ پیاری کتاب دینے کے بہانے دروازے پر آئی اور چپکے سے کہا، سب کا خیال ہے کہ اس مکان کے بالا خانے پر جن رہتے ہیں اگر تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو تو رات کو جن کا بھیس بدل کر آیا کرو لیکن کسی کو خبر ہو گئی تو جان پر آ بنے گی۔ حافظ نے کہا، جان کی کوئی پروا نہیں، میں دو تین دنوں میں انتظام کر کے آتا ہوں۔ حافظ عبدالکریم نہایت پریشانی کے ساتھ دل پر بوجھ لئے واپس ہوا۔ وہ دل ہی دل میں پیاری کی ذہانت کی داد دے رہا تھا جس نے یہ ترکیب سوچ کر ملاقات کی راہ سجھائی تھی۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ ضرور جن بن کر جائے گا چاہے اصل جنات اسے مار ہی کیوں نہ ڈالیں۔

www.ksars.org

حافظ عبدالکریم چپکے سے لکھنؤ پہنچا اور مختلف قسم کے عطر، اگربتی، شیرینی، کوئلے اور دیاسلائیاں خریدیں۔ دو ہاتھ لمبی موٹی موٹی سات آٹھ سلاخیں لوہے کی بنوالیں جس کے ذریعے بالا خانے پر چڑھ سکے۔ رات کے وقت وہ تمام سامان لے کے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بالا خانے پر چڑھا۔ بالا خانے پر کسی جگہ اگربتی سلگائی، کسی جگہ لوبان جلایا اور کہیں عطر، گلاب چھڑکا۔ پورا بالا خانہ خوشبویات سے مہک اٹھا۔ اچانک حافظ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ زینے کے راستے نیچے اترے گا تو جن بننے کے ڈرامے میں اصلیت کا رنگ نہیں آئے گا چنانچہ وہ کوٹھے پر سے صحن میں کود گیا۔ آواز سنتے ہی گھر والوں کی آنکھ کھل گئی۔ خواتین حواس باختہ ہو کر چیخنے لگیں۔ پیاری کی والدہ نے چراغ گل کر دیا تاکہ جن کی صورت دیکھ کر بچے ڈر نہ جائیں۔ حافظ نے دالان میں پہنچ کر کہا — تم روز کہتی تھیں کہ جن کی صورت نہیں دیکھی۔ چراغ جلاؤ اور ہماری شکل دیکھو۔ پیاری کی والدہ نے کانپتے ہوئے کہا، خدارا! ہم پر رحم کیجئے، ہم آپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔ حافظ نے آواز بدل کر تیز لہجے میں کہا۔ ہمارے آنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ تمہاری لڑکی قرآن پاک پڑھتی تھی تو ہم بھی سنا کرتے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ تین دن سے وہ لڑکا حافظ پڑھانے نہیں آرہا اور ہمیں تلاوت قرآن سننے کو نہیں مل رہی۔

پیاری کی والدہ نے ہمت کر کے جواب دیا، حافظ کو ہم نے اپنی بدنامی کی وجہ سے منع کر دیا ہے۔ اگر آپ قرآن شریف سننا چاہتے ہیں تو جس وقت آپ حکم کریں لڑکی اسی وقت تلاوت کر دیا کرے گی۔

حافظ نے جن کی آواز میں کہا، ہمیں قرآن شریف سننے سے مطلب ہے، حافظ کے آنے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہم روزانہ رات کو آئیں گے اور تلاوت سنیں گے۔

حافظ روزانہ رات کو بالا خانے پر چڑھ کر خوشبو جلاتا اور پھر نیچے کود پڑتا تھا۔ قرآن شریف سننے کے بعد زینے کے راستے سے بالا خانے پر چڑھ کر واپس چلا جاتا تھا۔ جن کے واقعے کی شہرت تمام بستی میں ہوگئی۔ کسی نے حاجی وارث علیؒ کی خدمت میں بھی یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے فرمایا، ''ہاں ہاں پڑھا جن ہے، پڑھا جن ہے''۔ ان الفاظ سے سب نے یہی مطلب اخذ کیا کہ کوئی عالم جن ہے اصل بات کی طرف دھیان نہیں گیا۔

www.ksars.org

ایک روز حافظ عبدالکریم نے تلاوت قرآن شریف کے بعد پیاری سے کہا، میں چند روز کے لئے لکھنؤ جارہا ہوں تاکہ جن بننے کا سامان لاؤں، تمہیں اگر کچھ منگانا ہو تو بتاؤ۔ پیاری نے عقیق البحر کی تسبیح کی فرمائش کی۔ حافظ کا خیال تھا کہ سب گھر والے سو رہے ہیں لیکن پیاری کی والدہ جاگ رہی تھیں اور انہوں نے یہ گفتگو سن لی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ بالاخانے کے جنات کو حافظ عبدالکریم نے عملیات کے ذریعے قابو کیا ہوا ہے اور ان کی مدد سے روزانہ یہاں پیاری سے ملنے آجاتا ہے۔ انہوں نے یہ بات اپنے تک محدود رکھی اور حافظ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ حافظ کئی دن تک جن کی شکل میں پیاری کے گھر جاتا رہا۔ تین ماہ بعد مہمان بن کر چچا کے گھر پہنچا تو خلافِ معمول پیاری کی والدہ نے اسے حافظ کے سامنے آنے سے منع کر دیا۔ حافظ دس پندرہ منٹ تک پریشان بیٹھا رہا لیکن پیاری سامنے نہیں آئی۔ اچانک وہ کمرے سے نکل کر حافظ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کی بڑی بہن نے کہا، تم کیوں باہر آئیں، اماں جان نے باہر آنے سے منع کیا تھا۔ پیاری نے کہا۔ اماں جان کی بات خلافِ عقل ہے حافظ عبدالکریم رشتے میں میرے بھائی ہیں اور مجھے قرآن شریف پڑھایا ہے۔ اگر اب ان سے پردہ کروں گی تو اس میں میری بدنامی ہے۔ اچانک پردہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟ پیاری کی یہ منطق سن کر تمام خواتین دم بخود رہ گئیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر حافظ کی طبیعت میں گھبراہٹ پیدا ہوئی اور وہ اُٹھ کر جانے لگا۔ پیاری کی والدہ نے بہت روکا لیکن حافظ نہیں رکا، تمام راستے اس واقعہ کا خیال اسے پریشان کرتا رہا۔ اس نے سوچا کہ اب جن کی شکل میں آکر ان لوگوں کی اچھی طرح خبر لے گا۔ راستہ میں بے اختیار ہو کر واپس پیاری کے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ حافظ کے جانے بعد پیاری کی والدہ نے اس کی خوب پٹائی کی ہے۔ یہ سن کر وہ مزید بدحواس ہو گیا۔

منصوبے کے مطابق حافظ اسی رات بالاخانے پر چڑھ کر صحن میں کودا۔ اس نے گزشتہ دن اہلِ خانہ سے جن کی آواز میں یہ کہہ دیا تھا کہ چند روز کے لئے ہم اجمیر شریف جارہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ مہمان بن کر اگلے روز چچا کے گھر جانا چاہتا تھا۔ اہلِ خانہ اس خلافِ اطلاع آمد پر حیران ہوئے، حافظ نے جن کی آواز میں غصے کے تمام تاثر پیدا کر کے کہا،

تم نے لڑکی کا پردہ حافظ سے کیوں کرایا اور حافظ کے جانے کے بعد اس کو کیوں مارا۔ ہمیں اس واقعے کی خبر ہوگئی ہے اس لئے ہم اجمیر شریف سے فوراً واپس آئے ہیں۔ یہ بات جان لو کہ ہم حافظ کے قبضے میں ہیں اور جو کچھ وہ حکم دے گا ہم اس کو بجالائیں گے۔ ہمیں تمہاری اس حرکت سے بہت رنج ہوا ہے، اب حافظ تمہارے گھر نہیں آئے گا۔

www.ksars.org

سارے گھر والوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ طرح طرح سے خوشامد کرنے لگے تاکہ خطابخش دی جائے لیکن حافظ (بشکلِ جن) نہ مانا۔ اگلے دن حافظ عبدالکریم مہمان بن کر پیاری کے مکان کے برابر میں ایک اور عزیز کے ہاں ٹھہرا۔ پیاری کی والدہ کو جب معلوم ہوا کہ حافظ آیا ہے اور کسی دوسرے عزیز کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے تو جنات کے ڈر سے انہیں بہت پریشانی ہوئی۔ کئی بار خادماؤں کو بھیجا کہ حافظ کو بلائیں لیکن حافظ نے آنے سے انکار کر دیا۔ رمضان کا مہینہ تھا چنانچہ جب افطار کا وقت ہوا تو انہوں نے افطار بھی بھیجا۔ حافظ نے افطار میں سے روزہ کھولا اس خیال سے کہ افطاری کی تیار میں پیاری کے ہاتھ لگے ہوں گے پھر اس افطار میں کہیں اور سے آئی ہوئی افطاری ملا کر چچی صاحبہ کے گھر واپس کر دی۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ حافظ نے ان کے گھر کی افطاری نہیں کھائی تو ناراضی دور کرنے کے لئے رات کو خود گئیں اور زبردستی ساتھ لے کر آئیں۔ کھانے کے لئے بٹھایا اور پیاری سے کہا کہ وہ حافظ کے لئے کھانا لائے۔ حافظ عبدالکریم نے پیاری کے خیال میں کھانا شروع کیا تھا کہ اچانک چچی صاحبہ کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی۔ وہ سب گھر والوں کو مارنے لگیں لیکن حافظ اور پیاری کو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ مارتے مارتے وہ کنوئیں کی طرف دوڑیں لوگوں نے فوراً پکڑا۔ نصف شب تک چچی کا دماغی توازن اسی طرح خراب رہا، پیاری نے گھبرا کر حافظ سے پوچھا، کہیں آپ نے تو کچھ نہیں کر دیا۔ حافظ عبدالکریم نے جواب دیا، یقین جانو میں نے کچھ نہیں کیا۔ شاید حرارت قلب زیادہ ہونے سے حواس پر اثر پڑا ہے۔ پیاری کی بڑی بہن نے حافظ عبدالکریم سے کہا، آپ ایک خط والد صاحب کے نام لکھ دیں تاکہ ملازم کے ہاتھوں بھیج کر جہانگیر آباد سے انہیں بلا لیا جائے کیوں کہ والدہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ حافظ نے خط لکھ دیا لیکن اس بات کا اندیشہ اسے پریشان کئے ہوئے تھا کہ پیاری کے والد جہانگیر آباد سے آگئے تو نہ جانے کیا حالات پیش آجائیں۔ اس نے عظمت نامی ملازم کو الگ لے جا کر پوچھا، عظمت تم جانتے ہو یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عظمت نے کہا، مجھے سب معلوم ہے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے آپ کو ناراض کر دیا ہے اور آپ کے قبضے میں جو جنات ہیں وہ انہیں پریشان کر رہے ہیں۔ جب تک یہ لوگ آپ کو راضی نہیں کریں گے اسی حالت میں رہیں گے۔

حافظ دل میں خوش ہوا کہ عظمت بھی جنات کی کارروائی کا قائل ہے۔ اس نے کہا، میں جنات کو بہت سمجھا رہا ہوں لیکن وہ مانتے نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم خط لے جاؤ اور وہ تمہارے خلاف بھی کارروائی کریں۔ عظمت خوف کے مارے کانپنے لگا۔ حافظ

www.ksars.org

نے کہا، ایسا کرو کہ جب تمہیں خط ملے تو تم باہر جاتے ہی زمین پر گر کر لوٹنے لگنا گویا کہ تمہارے اوپر بھی جنات مسلط ہو گئے ہیں۔ اس طرح تم خط لے جانے سے بچ جاؤ گے اور لوگ سمجھیں گے کہ تمہارے اوپر بھی جنات مسلط ہو گئے ہیں۔

عظمت نے ایسا ہی کیا۔ خط لے کر کچھ دور چلا اور زمین پر گر کر لوٹنے اور چیخنے پکارنے لگا۔ جو قریب گیا اس کو زوردار طمانچہ رسید کیا۔ پیاری کے ایک عزیز آئے ہوئے تھے اور پیاری کی والدہ کی طبیعت بحال کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے، شور سن کے باہر آئے اور یہ منظر دیکھ کر کہا، مستورات کی حالت پہلے سے خراب ہے، ایک مرد تھا اس کا بھی یہ حال ہو گیا ہے۔ حافظ نے تو حد کر دی ہے تمام گھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ حافظ کے پاس آئے اور کہا، بھائی ان کی غلطی کو معاف کرو۔ کیا کسی کا خون کر کے خوش ہو گے۔ مستورات بے پردہ ہو جائیں گی تب تمہیں چین آئے گا۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ عظمت اٹھ کر گھر میں آیا اور کہا، اگر کسی نے حافظ عبدالکریم کے خلاف کوئی بات کی تو اچھا نہیں ہو گا۔ پیاری کی والدہ نے جن کی طبیعت اس وقت کسی قدر بہتر ہو گئی تھی کہا، میں ان کے خلاف کچھ نہیں کروں گی بلکہ جو وہ کہیں گے کیا جائے گا۔

حافظ عبدالکریم صبح کے وقت اپنے گھر روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ پیاری کے ایک قریبی عزیز بھی تھے۔ ان سے حافظ کی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ انہوں نے کہا، میں جہانگیر آباد پیاری کے والد کے پاس جا رہا ہوں تم بھی چلو۔ میں رات کے واقعہ کا ذکر کروں گا اور ان پر زور دوں گا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی تم سے کر دیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو رسوائی کے علاوہ کسی نہ کسی کا خون ہو جائے گا۔

حافظ عبدالکریم ان کے ساتھ جہانگیر آباد چلا گیا پیاری کے عزیز نے تمام واقعہ تفصیل سے بیان کیا اور کہا کہ حافظ کے قبضے میں دو جن بھی ہیں۔ پیاری کے والد تمام واقعہ اور جنات کا سن کر طیش میں آ گئے، کہا: ”چاہے کچھ ہو جائے، ہرگز شادی نہیں ہو گی۔“

پھر حافظ سے نہایت برہمی میں انہوں نے کہا، جنات کیا تم نے قابو میں کر لئے ہیں سمجھتے ہو کہ خدائی قبضے میں کر لی ہے، سارے گھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہم اسی وقت گھر جا رہے ہیں، دیکھتے ہیں کہ جنات ہمارا کیا کر لیتے ہیں۔

www.ksars.org

حافظ عبدالکریم نے نہایت اطمینان اور بے پروائی سے جواب دیا، وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جنات تو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ چاہیں تو ابھی اور یہیں تماشہ دیکھ لیجئے۔

غیر متوقع جواب سن کر پیاری کے والد کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ گھبرا کر کہنے لگے، کیا یہاں بھی تم اپنے گھرانے کو بے آبرو کرو گے۔

حافظ نے کہا، آپ لوگ خود ہی جنات سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، میں نے تو انہیں روک رکھا ہے۔ اس وقت تو جنات میرے ساتھ موجود ہیں اور اجازت طلب کر رہے ہیں۔

پیاری کے والد نے کہا، خدا کے لئے معاف کرو، تین دن بعد مجھ سے ملنا۔ میں سوچ کر تمہیں جواب دوں گا۔

حافظ عبدالکریم تیسرے روز جہانگیر آباد پہنچا۔ پیاری کے والد کے پاس بہت سے لوگ مہمان تھے جو ان کے رشتے دار بھی تھے، کسی نے حافظ سے بات نہیں کی۔ حافظ واپس اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوا تو پیاری کے ایک رشتہ دار ساتھ ہوئے۔ دوران سفر انہوں نے کہا، بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہاری وجہ سے ایک خون ہونے والا ہے حافظ کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا، لڑکی کے والد اور چچا کو تم دونوں کے جذبات کا علم ہو گیا ہے۔ شرفاء میں اس قسم کے واقعات سے بڑھ کر کوئی بات باعث شرم نہیں ہوتی۔ اس لئے تمام رشتہ داروں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ لڑکی کو مار دیا جائے تاکہ مزید بدنامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کام کے لئے ابھی ابھی دونوں بھائی دیوا شریف گئے ہیں۔

حافظ عبدالکریم کے پیروں تلے زمین نکل گئی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ پیاری کے عزیز نے حافظ کو مشورہ دیا، میاں! اب تو تمہارا زندہ رہنا لاحاصل ہے۔ تمہیں بھی اپنی جان کا نذرانہ دے دینا چاہئے۔

حافظ عبدالکریم نے اپنے گھر جانے کا ارادہ ترک کیا اور اسی وقت دیوا شریف کو چلا جہاں پیاری کا گھر تھا۔ راستے بھر طرح طرح کے خیالات اس کے دل و دماغ پر چھائے رہے۔ بار بار اس کے دل سے یہی آواز آتی کہ پیاری کے بعد رہنا بیکار ہے، تم کو بھی جان دے دینی چاہئے اور اسی کے گھر میں جو کنواں ہے اس میں کود کر چراغِ زندگی گل کر دینا چاہئے۔

www.ksars.org

حافظ عبدالکریم سہ پہر کو دیوا شریف میں پیاری کے مکان پر پہنچا وہاں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی اور دروازہ بند تھا۔ یہ خاموشی اسے موت کا سناٹا محسوس ہوئی اور یہ خیال بن گیا کہ پیاری اس دنیا میں نہیں رہی۔ حافظ نے کئی چکر مکان کے لگائے لیکن کھڑکی کھلی دکھائی دی اور نہ کوئی دروازہ، رمضان شریف کے دن تھے۔ بوقت افطار حافظ نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔

حافظ عبدالکریم نے اِلا اللہ کا نعرہ لگایا اور مکان کے اندر داخل ہو کر سیدھا کنوئیں تک پہنچا اور سر کے بل کنوئیں میں چھلانگ لگادی۔ چھلانگ لگاتے ہی ایک عجیب معاملہ ہوا۔ حافظ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے جسم کو سنبھال لیا ہے اور جب وہ نیچے پہنچا تو اس کا سر اوپر اور پیر نیچے تھے۔ پھر بھی اس کے دونوں ہاتھوں میں سخت چوٹ آئی۔ ایک ہاتھ کی تو ہڈی ٹوٹ کر باہر نکل آئی۔ اتفاقاً پیاری کی والدہ نے حافظ کو کنوئیں میں چھلانگ لگاتے دیکھ لیا، انہوں نے شور مچا کر رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو جمع کر لیا۔ رشتہ داروں نے پیاری کو ایک کمرے میں بند کر کے قفل لگادیا اور کنوئیں میں اینٹیں اور پتھر برسانے شروع کر دیئے، شور و غل اتنا زیادہ ہوا کہ ہر طرف اطلاع پھیل گئی۔ سید معروف شاہ وارثی دیگر معززین شہر کو لے کر حافظ کی اعانت کے لئے پہنچے۔ پیاری کی والدہ پر اظہار ناراضی ہوا اور کنوئیں کے قریب پہنچ کر آوازیں دیں۔ کنوئیں کے اندر حافظ گھٹنوں تک پانی میں کھڑا ہوا تھا۔ اُدھر پیاری کمرے میں چیخ رہی تھی کہ آج تم لوگوں نے حافظ بھائی کی جان لے لی، اب تو خدارا دروازہ کھول دو۔ یہ آواز حافظ کے کانوں میں پہنچی تو اس کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی اس نے پوری قوت سے آواز لگائی، میں زندہ ہوں، جلدی سے نکالو۔

حافظ کو باہر نکالا گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ایک نعرۂ مستانہ لگایا ——"مزا ہے پیاری کا"۔ سید معروف شاہ حافظ کو اپنے مکان پر لائے، دودھ پھٹکری پلائی اور کہا، میں کہاروں کو بلاتا ہوں وہ تمہیں پالکی میں بٹھا کر تمہارے گھر چھوڑ دیں گے۔ لڑکی کے والد جہانگیر آباد سے آنے والے ہیں، نہ جانے تمہارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے۔ لڑکی کا معاملہ ہے اس لئے تمام بستی والے بھی اُن کا ساتھ دیں گے۔ حافظ نے کہا، مجھے جان کی پرواہ نہیں ہے، میں نے تو جان دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، جان جانے سے رہ گئی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ حافظ کے ایک رشتہ دار اسے اپنے گھر لے گئے۔ اسی

www.ksars.org

رات پیاری کے والد بھی جہانگیر آباد سے آ گئے۔ حافظ کی حالت عجیب تھی اسے نہ چوٹ کا احساس تھا اور نہ تکلیف کا خیال ،وہ پوری رات جاگتا رہا۔

صبح کو یہ اطلاع زبان زدِ عام ہوئی کہ حاجی وارث علی شاہؒ دیوا تشریف لا رہے ہیں۔ اس زمانے میں حافظ عبدالکریم کا حاجی صاحبؒ کے بارے میں صرف یہ خیال تھا کہ حاجی صاحبؒ ایک پیر ہیں جن کا سب لوگ حکم مانتے ہیں۔ حافظ، حاجی صاحبؒ سے بیعت تو ہو گیا تھا لیکن مرتبۂ ولایت کا ادراک واحساس اسے نہ تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ لوگ جب اس معاملے کی اطلاع انہیں دیں گے تو ایسا نہ ہو کہ وہ اسے دیوا شریف سے باہر نکلوا دیں۔ حافظ نے ان تمام لوگوں سے جو حاجی صاحبؒ سے قربت رکھتے تھے۔ طرح طرح خوشامد کی اور بڑی منت سماجت سے کہا، خدا را سفارش کر کے مجھے دیوا شریف سے نہ نکلنے نہ دینا لیکن جو بھی یہ بات سنتا کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا تھا۔

صبح آٹھ بجے سید معروف شاہ وارثی اور دیگر معززین شہر حاجی صاحبؒ کے استقبال کے لئے پہنچے۔ حاجی صاحبؒ ان لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا:

''کیوں کیوں! حافظ کنوئیں میں کود پڑا۔ کیوں ایسا کہا جو وہ کود پڑا۔'' پھر سید معروف شاہ سے مخاطب ہوئے — ''سنا سنا محبت ایسی تو ہو جیسی حافظ کو ہے'' سید معروف شاہ نے تمام روئیداد عشق بیان کی۔ حاجی صاحب نے فرمایا، پاک محبت ہے مگر دنیا کے لوگ نہیں مانیں گے اور ان کی بدنامی ہو گی۔ حافظ عاشق ہے، حافظ عاشق ہے۔

جب لوگوں نے حاجی صاحب کی یہ باتیں سنیں حافظ کی طرفداری میں بولنا شروع کر دیا۔ حافظ کو جب اس بات کا علم ہوا تو ہمت کر کے حاجی صاحب کے پاس پہنچا۔ اقامت گاہ کا دروازہ بند تھا۔ خادم نور محمد شاہ نے حافظ کے آنے کی اطلاع دی۔ حاجی صاحب نے فرمایا—— حافظ مستان، حافظ مستان۔ حافظ اندر داخل ہوا تو حال یہ تھا کہ وہی خون آلود کپڑے جسم پر تھے جو کنوئیں میں گرتے وقت پہنے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے کہا، حافظ، حافظ، ضبط نہیں ہوا، کنوئیں میں کود پڑے۔ کون سا ہاتھ ٹوٹا، کون سا ہاتھ ٹوٹا——؟

www.ksars.org

یہ کہتے کہتے حاجی صاحب نے حافظ کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو ہڈی اپنی جگہ بیٹھ کر بالکل جُڑ گئی۔ چوٹ کا اثر ختم ہو گیا۔ حاجی صاحب نے کہا، حافظ حافظ ! وہ لوگ تمہارے دشمن ہو گئے ہیں، اب ان کے گھر نہیں جانا۔

حافظ نے یہ حکم سن تو لیا لیکن دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ محبوب کے در کو چھوڑ دے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے عزم کو دہرایا، میں ضرور جاؤں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ حاجی صاحب نے کئی مرتبہ زور دے کر کہا،

''تم نہیں جانا، وہ لوگ مار ڈالیں گے۔''

حاجی صاحب سے رخصت ہو کر حافظ باہر نکلا تو دیوانگیِ شوق نے اس قدر شدت اختیار کی کہ بے تابانہ پیاری کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہاں موجود لوگوں نے اس کی خوب پٹائی کی اور دھکے دے کر نکال دیا۔ بعد ازاں پیاری کے گھر والوں نے کئی چوکیدار مقرر کر دیئے تا کہ حافظ مکان کی طرف نہ آئے۔ نیز کئی عورتیں بھی ہمہ وقت پیاری کے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک روز حافظ بے تابی کے عالم میں صدا لگاتا ہوا پیاری کے گھر پہنچ گیا۔ اسی وقت پیاری بھی دوڑتی ہوئی چھت پر چڑھ گئی۔ عورتوں نے اسے پکڑا اور کھینچتی ہوئی نیچے لے گئیں۔ مکان کے زینے کو توڑ کر گرا دیا گیا۔

حافظ عبدالکریم کی حالت دیوانگی یہ ہو گئی کہ اس کا نام حافظ پیاری رکھ دیا گیا۔ لوگ اس سے مذاقاً کہتے حافظ ! پیاری نے کہا ہے کہ میرے نام سے سو جوتے مارو۔ پیاری کا نام سن کر حافظ بسر و چشم سر جھکا کر بیٹھ جاتا اور لوگ اسے جوتے مارتے۔ حاجی صاحب کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو حافظ کو بلا کر کہا، حافظ تم کسی کے کہنے سننے میں نہ آیا کرو اور نہ کسی کا اعتبار کرو، جب وہ خود آ کر کہے تو یقین کیا کرو۔

حافظ عبدالکریم پیاری کے مکان کے گرد طواف کرتا اور مختلف صدائیں لگاتا رہتا۔ حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ ارشاد فرماتے، جاؤ منعم صاحب کے مزار پر صدا لگاؤ۔ چنانچہ حافظ اکثر شاہ منعم صاحب کے مزار پر حاضر ہو کر صدائیں لگاتا اور دیوان حافظؒ کے اشعار پڑھتا۔ ایک روز اس نے پیاری کے مکان کا طواف کیا اور صدا لگائی تو پیاری کی والدہ دیگر عورتوں کو ساتھ لے کر حاجی صاحب کے پاس پہنچیں اور کہا، حضرت ! حافظ ہمیں بدنام کرتا ہے اور ہماری لڑکی کا نام سب

www.ksars.org

کے سامنے لیتا ہے۔ حاجی صاحب نے کہا، وہ ایسا ہے تو ہم اسے ابھی دیوا سے نکلوا دیتے ہیں۔ خادم نور محمد شاہ کو حکم دیا، حافظ کو ابھی پکڑ کر لاؤ۔ نور محمد شاہ نے یہ واقعہ حافظ کو بتایا تو حافظ ایک چاقو اپنے ساتھ لے کر گیا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اگر حاجی صاحب نے اسے دیوا شریف سے نکلنے کا حکم دیا تو وہ اسی چاقو سے خود کو ہلاک کر لے گا۔ حافظ حاجی صاحب کے پاس پہنچا لیکن انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے حافظ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ اسی زمانے میں حافظ اکثر پتنگ اڑاتا اور جان بوجھ کر پتنگ پیاری کے گھر میں گرا دیا کرتا۔ پھر یہ کہتے ہوئے مکان پر جا پہنچتا کہ ہماری پتنگ آ گری ہے۔ کئی بار وہاں سے خوب زدو کوب کر کے باہر نکالا گیا۔ حاجی صاحبؒ نے حافظ کو بلا کر کہا، حافظ! تم ہمارے کوٹھے پر پتنگ اڑایا کرو۔

راہِ عشق میں مصائب و آلام برداشت کرتے ہوئے تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ طرح طرح کے واقعات اور معاملات پیش آتے رہے۔ ایک روز حاجی وارث علی نے حافظ عبدالکریم سے کہا—— حافظ حافظ! تم ہماری صورت دیکھا کرو پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی، ترجمہ:

ہم تمہاری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

حافظ نے کہا، حضور! دنیا میں اُس سے زیادہ کوئی حسین نہیں ہے۔ کس کو دیکھوں؟ اگر آپ اُس سے زیادہ حسین ہوتے تو آپ کو دیکھتا۔

یہ جواب سن کے حاجی صاحب مسکرائے اور حافظ کو گلے لگا کر فرمایا، عاشق کے سوا کسی کی جرأت نہیں کہ ایسی بات کہہ سکے۔

ایک عرصے بعد حاجی وارث علی؟ نے حافظ سے کہا، حافظ حافظ! خدا اور سول تم کو ملیں۔ وہ لڑکی ملے یا نہ ملے۔

حافظ نے گھبرا کر کہا، نہیں حضور! مجھے کچھ نہ ملے وہ لڑکی مل جائے۔ اگر خدا اور رسولؐ کو بھی اسی صورت میں دیکھوں گا تو مانوں گا ورنہ میں سے باز آیا۔ یہ سن کر حاجی صاحبؒ نے فرمایا، عاشق کے سوا کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا۔

حافظ عبدالکریم پر عشق کی کیفیت کا غلبہ ہوتا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلتا—— ''مزا ہے پیاری کا'' دیوانِ حافظؒ کے اشعار اکثر اس کی زبان پر ہوتے تھے۔ ایک روز حافظ کو معلوم ہوا کہ پیاری اور اس کی والدہ حاجی صاحب کے پاس گئی ہیں۔

www.ksars.org

حافظ مکان کے زنانہ حصے میں پہنچ گیا اور صدا لگائی۔ حاجی صاحب نے ماں بیٹی کو رخصت کر دیا لیکن حافظ کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر پیاری کی والدہ نے مرزا منعم بیگ وارثی کو بلا کر کہا کہ حافظ کو دروازے سے ہٹایا جائے۔ مرزا صاحب نے حافظ سے کہا، یہ زنانہ دروازہ ہے، اگر صدا لگانی ہے تو مردانہ حصے کی طرف جاؤ۔ مرزا صاحب نے حافظ کو ملعون کیا اور کہا، میں حاجی صاحب سے تمہاری شکایت کر کے تمہیں نکلواتا ہوں۔ حافظ نے کہا، جاؤ تم خدا سے کہہ دو میں نہیں جاؤں گا۔ مرزا صاحب کی عجیب حالت ہو گئی۔ کبھی اندر کی طرف جاتے اور پھر باہر آ جاتے۔ اسی وقت پیاری، حافظ کے پاس آئی اور کہا، حافظ بھائی! کسی سے کچھ کہتے تھوڑا ہی ہیں۔ پیاری کو سامنے دیکھ کر حافظ کی حالت ناقابل بیان ہو گئی اور اس نے سر تسلیم جھکا دیا۔

پیاری اور اس کی والدہ رخصت ہو گئیں۔ مرزا منعم بیگ صاحب نے حاجی وارث علی سے حافظ کی شکایت کی۔ حاجی صاحب نے حافظ کی طرف ایک نگاہ کی اور مسکرا کر کہا، عبدالرؤف (پیاری کے والد) کے گھر میں کہہ دو کہ اپنی لڑکی کو لے کر ہمارے پاس نہ آیا کریں۔ حافظ عاشق ہیں، کسی روز پکڑ لیا تو قیامت تک چھوٹنا مشکل ہے۔

حافظ عبدالکریم عشق کی سرمستی میں اس حد تک پہنچ گیا کہ ہوش و خرد رخصت ہو گئے۔ لوگ ان کی اس حالت کا نہ صرف مذاق اڑاتے بلکہ طرح طرح سے فائدہ اٹھاتے۔۔۔ نائن پیاری کے ناخن اور بال لے کے آتی اور حافظ کثیر رقم دے کر خرید لیتا تھا۔ دھوبن اس کے کپڑے لاتی حافظ اسے پیسے دیتا اور پیاری کے کپڑوں کو دیکھتا اور اس کی خوش بو سونگھتا، اس طرح اس نے ایک بڑی رقم صرف کر دی۔

حافظ اکثر حاجی وارث علی کی خدمت میں طرح طرح کی مٹھائیاں اور تحائف پیش کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حاجی صاحب ان چیزوں کو تقسیم کریں گے تو کچھ نہ کچھ پیاری کے گھر بھی جائے گا۔ یہ خیال اس کی قلبی تسکین کا باعث بنتا۔ حافظ جو تحفہ پیش کرتا حاجی صاحب اسے تقسیم کرنے کے بجائے پورے کا پورا پیاری کے گھر بھجوا دیتے تھے۔

ایک روز کسی شخص نے حافظ سے کہا، حافظ اگر تم پانچ سو روپے مجھے دو تو تمہیں پیاری سے ملوا دوں گا۔ حافظ کے پاس رقم نہیں تھی اس لئے خاموش ہو گیا۔ ان صاحب نے متبادل راستہ بتاتے ہوئے کہا کہ فلاں رئیس حاجی صاحب کے پاس آئے

www.ksars.org

ہوئے ہیں، ان کی جیب میں سونے کی ایک نہایت قیمتی گھڑی ہے۔ کسی طرح وہ گھڑی تم ہمیں لادو تو ہم تمہارا کام کر دیں گے۔ حافظ دن کے دس گیارہ بجے کوٹھے پر چڑھا، سیدھے کمرے میں داخل ہو کر جیب سے گھڑی نکالی اور تیر کی تیزی سے واپس ہو کر کوٹھے پر سے کود پڑا۔ رئیس چلائے کہ حافظ! گھڑی لے کہاں جارہے ہو۔ شور سن کر لوگوں نے حافظ کو پکڑ لیا اور گھڑی سمیت حاجی صاحب کے سامنے پیش کیا۔ حاجی صاحب نے فرمایا، حافظ کو نکال دو۔ یہاں آنے نہ پائیں اور جہاں یہ ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے بھی کہو کہ اپنے مکان پر ٹھہرنے نہ دیں۔ یہ ہمیں بدنام کرتے ہیں، لوگ کہیں گے کہ ہم لوگوں سے چوری کراتے ہیں اور ہماری بھی شراکت ہوگی۔ چنانچہ حافظ کو شہر سے نکال دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد حافظ کو معلوم ہوا کہ حاجی وارث علی رودولی تشریف لے گئے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ پیاری کے گھر والوں نے منت مانی ہے کہ اگر حافظ کو نکال دیا جائے تو وہ حاجی صاحب کی دعوت کریں گے اور ان کو نیا احرام پیش کریں گے اور جلد ہی وہ اس تقریب کا اہتمام کرنے والے ہیں۔ یہ خبر سن کر حافظ کے دل کی حالت بُری ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ وہ بھی حاجی صاحب کی دعوت کرے گا اور خاص دیوا میں، جہاں سے وہ نکالا جاچکا ہے۔ حافظ رودولی پہنچ کر حاجی صاحب کے خادموں سے ملا اور انہیں تحائف وغیرہ دیئے تاکہ وہ حاجی صاحب کو مناسب وقت اطلاع کریں۔ حاجی صاحب نے فرمایا، وہ ہماری دعوت دیوا میں کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ چوری سے بدنام ہوگئے اور ہمیں بھی بدنام کیا ہے۔ رات کو پھر لوگوں نے حافظ کا مدعا پیش کیا تو فرمایا، اچھا بلاؤ، حافظ ڈرتے ڈرتے اندر گیا۔ حاجی صاحب نے تمام حال پوچھا اور کہا، اگر تم سے کوئی یہ کہے کہ ہماری گردن ماردو تو ہم اس لڑکی (پیاری) سے ملادیں گے تو تم کیا کروگے؟

حافظ نے نہایت بے باکی سے کہا، حضور میرے بس میں ہوتا تو ضرور ایسا کر گزرتا۔

حاجی وارث علی مسکراتے ہوئے اُٹھے اور حافظ کو گلے لگا کر کہا، جاؤ دیوا میں تمہاری دعوت ہمیں منظور ہے۔

حاجی وارث علی دیوا تشریف لے گئے تو پیاری کے گھر والوں نے دعوت کی اور احرام پیش کیا۔ حاجی صاحب کے سامنے شیرینی پیش ہوئی تو حافظ یہ سوچ رہا تھا کہ اس شیرینی میں پیاری کے ہاتھ بھی لگے ہوں گے خدا کرے مجھے بھی نصیب ہو۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ سب کو شیرینی تقسیم کی گئی لیکن حافظ کو نہیں ملی۔ اچانک حاجی صاحب نے کہا، حافظ! تم کو

www.ksars.org

حصہ نہیں ملا پھر اپنے ہاتھ سے مٹھائی دی۔ پیاری کے گھر سے کھانا آیا تو کھانے میں سے بھی عطا کیا اور فیرینی کی رکابیاں بھی حافظ کو دیں۔ حافظ فیرینی کھانے کے بعد رکابیاں بھی توڑ توڑ کر کھا گیا۔ بعد ازاں حافظ نے حاجی وارث علی کی دعوت کی اور احرام تبدیل کرایا۔

کچھ عرصہ بعد پھر حافظ کی شکایتیں حاجی وارث علی تک پہنچیں تو آپ نے حافظ کو دیوا سے چلے جانے کا حکم دیا۔ حافظ دیوا سے باہر خستہ حال و پریشان پھرتا رہا۔ ایک روز حلوہ لے کے حاجی صاحب کے پاس پہنچا، خادموں نے اندر اطلاع کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ ایک نووارد شخص نے اندر جا کر حاجی صاحب سے کہا، ایک عاشق آیا ہے۔ فرمایا، عاشق کو کون روک سکتا ہے، اندر آنے دو۔

حافظ، حاجی صاحب کے پاس پہنچا تو وہ مسکرائے۔ حلوہ پیش کیا تو اسی وقت سارا حلوہ پیاری کے گھر بھجوا دیا۔ ان دنوں پیاری کے چچا اپنے بھائی کے گھر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے حافظ کو بلوایا۔ حافظ خوشی خوشی پیاری کے گھر پہنچ گیا۔ چچا صاحب نے پہلے تو حافظ کو سمجھایا کہ وہ پیاری کا نام لینا ترک کر دے اور دیوا سے چلا جائے لیکن حافظ نہ مانا۔ انہوں نے دست پناہ گرم کر کے حافظ کو داغنا شروع کر دیا۔ کسی شخص نے حاجی صاحب تک اطلاع پہنچائی کہ حضور! آج فیصلہ ہو گیا۔ حافظ ان کے گھر میں بند ہے۔ ضرور مار ڈالیں گے، حاجی صاحب اٹھ کر دروازے تک آئے اور فرمایا، عاشق کو مار ڈالنا دل لگی نہیں ہے۔ خدام نے گھبرا کر کہا، حضور! عاشق ہیں، گھر میں گھس گئے ہوں گے۔ پھر خدام پیاری کے گھر پہنچے اور حافظ کو نکال کر حاجی صاحب کے پاس لائے۔ حافظ نے اس وقت پیاری کے ہاتھ کا سلا ہوا کرتا پہنا ہوا تھا۔ کرتا جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور جسم زخموں سے داغدار تھا لیکن حافظ کو صرف اس بات کا ملال تھا کہ پیاری کے ہاتھ کا سلا ہوا کرتا پھٹ گیا۔ اپنے زخموں کی اسے قطعی پرواہ نہیں تھی۔ حاجی صاحب نے دیکھ کر فرمایا، ظلم کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا، حافظ کو مارنے سے کیا حاصل۔

حافظ اسی مجذوبانہ حالت میں زندگی گزارتا رہا ایک روز حاجی وارث علی نے حافظ کو بلایا اور کہا، تم بہرائچ جاؤ اور کل آکر ہم سے پیتے پور میں ملو۔ حافظ اس وقت پیدل بہرائچ پہنچا اور حضرت سید سالار مسعود غازی کے مزار پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے غنودگی کی لہر آئی اور اس نے دیکھا کہ وہ اپنے گاؤں میں مکان پر بیٹھا ہے۔ اتنے میں حاجی وارث علی تشریف لائے اور فرمایا،

www.ksars.org

حافظ ! تم ہماری دعوت کرو تو پیاری تمہیں مل جائے گی۔ گیارہ تاریخ اور دن دوشنبے کا ہونا چاہئے۔ اب ہم دیوا جا رہے ہیں تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔

غنودگی کی اسی کیفیت میں حافظ دیوا پہنچا اور شاہ منعم صاحب کی درگاہ میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ مزار کا تعویذ غائب ہے اور شاہ منعم صاحب بیٹھے ہوئے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہیں۔ حافظ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا،

یہ تو فرمائیے، پیاری مجھے کب ملے گی؟

شاہ منعم صاحب نے جواب دیا، چادر چڑھاؤ گے تو ملے گی۔ یہ کہہ کر انہوں نے حافظ کو واپسی کا اشارہ کیا۔ حافظ کی آنکھ کھل گئی، دیکھا کہ وہ حضرت سید سالارؒ کے مزار پر بیٹھا ہوا ہے۔

حافظ مزار سے باہر نکلا تو ایک اجنبی شخص آیا اور تین سو روپے حافظ کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔ حافظ دوسرے دن پیتے پور پہنچا ۔ حساب لگایا تو پیر کے دن گیارہویں تاریخ آنے والی تھی۔ چنانچہ حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچ کر کہا، گیارہ تاریخ کو پیر کے دن آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ حاجی صاحب نے فرمایا، پیر کے بجائے جمعہ کو کر دینا۔ حافظ نے کہا، حضور ہی نے پہلے پیر کا دن مقرر فرمایا تھا۔ مسکرا کر جواب دیا، اچھا یہی سہی۔

حافظ عبدالکریم دیوا پہنچا اور شاہ منعم صاحب کے سجادہ نشین سے ملا۔ ان سے عالم رویاء کا تمام واقعہ بتایا۔ حافظ نے جو شکل و شباہت شاہ منعم صاحب کی دیکھی تھی، سجادہ نشین نے اس کی پوری تصدیق کر دی۔۔۔۔

گیارہ تاریخ کو صبح دس بجے حافظ نے حاجی وارث علی کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ حاجی صاحبؒ نے پوچھا، شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر چادر کب چڑھاؤ گے ؟۔ حافظ نے کہا، حضور کی دعوت کے بعد وہاں جاؤں گا۔ دعوت کے بعد حافظ شاہ منعم صاحب کے مزار پر حاضر ہوا اور چادر چڑھائی۔ حاجی صاحب کی دعوت کرنے اور شاہ منعم صاحب کے مزار پر چادر چڑھانے کے بعد حافظ کو یقین ہو گیا کہ اب کوئی شخص پیاری کو اس سے نہیں چھین سکتا، اس کے دل کی حالت نا قابل بیان تھی۔ اس کا رواں رواں خوشی سے سرشار تھا۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ اب وقت کا انتظار کرنا فضو

www.ksars.org

ل ہے، گھر میں جا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے آنا چاہئے۔ یہ خیال اس کے دل میں راسخ ہو گیا۔ وہ کشاں کشاں پیاری کے گھر کی طرف چل پڑا۔ قدم رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ راستے میں حاجی وارث علی کا آستانہ تھا۔ وہاں پہنچ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ خیال آیا کہ چلو پہلے قدم بوسی کر لیتے ہیں پھر پیاری کے گھر چلتے ہیں۔ دیکھا کہ آستانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ حافظ اندر داخل ہو کر حاجی صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔

حاجی وارث علی تو دکھائی نہ دیئے البتہ ایک ایسا منظر اس کا منتظر تھا جو بجلی بن کر اسے کے ہوش و حواس پر گرا۔ حافظ پتھر کا بت بن کر رہ گیا اور پلکیں جھپکانے کی طاقت تک باقی نہ رہی۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہی معصوم روپ ہے، وہی دلکش انداز ہے وہی رنگ و رعنائی ہے وہی پیاری ہے جس نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ پیاری کانوں میں بجلیاں اور گلے میں چندن ہار پہنے گلابی دوپٹہ اوڑھے بیٹھی تھی۔ پیاری نے نظریں اُٹھا کر حافظ کی طرف دیکھا، ایک برق سی حافظ کی نگاہوں کے سامنے کوند گئی۔ حافظ ہوش و حواس کھو بیٹھا اور بے اختیار سر بسجود ہو گیا۔ چند ثانیوں کے بعد ہوش و حواس بحال ہوئے تو دل چاہا کہ دوبارہ اس مجسمۂ حسن کو دیکھے۔ سر جو اٹھایا تو عالم حیرت و تحیر میں ڈوب گیا۔ وہاں نہ پیاری موجود تھی اور نہ اس کے حسن و جمال کی روشنی بلکہ حاجی وارث علی شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا، حضور یہ کیا؟۔ فرمایا،

”یہی صورت ہے، اس کے ساتھ تمہارا حشر ہے اور جہاں کہیں دیکھو گے اسی صورت کو دیکھو گے۔“

اس مشاہدے اور ان الفاظ میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ حافظ عبدالکریم کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ ماضی کے تمام جذبات و خیالات اس طرح ختم ہو گئے جیسے پانی ریت پر بنے نقوش کو مٹا دیتا ہے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ خواب دیکھتا رہا ہے اور اب تک کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ اس کی نگاہوں نے حاجی وارث علی کے اندر ایک ایسا نظارہ دیکھا تھا جس کی حقیقت و معنویت اس کے قلب پر ظاہر ہو گئی تھی۔

اس منظر کو دیکھنے کے بعد حافظ عبدالکریم عرف حافظ پیاری صاحب نے کبھی پیاری کے گھر کا رخ نہیں کیا اور نہ کبھی ان کی زبان سے پیاری کا نام سنا گیا البتہ کبھی کبھی وہ کہتے، ”مزا ہے پیاری کا اور سب جھول ہے“ (یعنی بے معانی ہے)۔ جن

www.ksars.org

لوگوں نے راہ عشق میں حافظ پیاری صاحب کی وارفتگی و شیفتگی اور جذب و جنون کو دیکھا تھا یہ امر ان کے لئے ہمیشہ باعث صد حیرت و استعجاب بنا رہا کہ آخر وہ کیا قوت تھی، وہ کیا راز تھا جس نے ہفتوں مہینوں سالوں نہیں بلکہ چشم زدن میں ان کو یکسر بدل دیا تھا۔

حافظ عبدالکریم ہمیشہ حاجی وارث علی شاہ کے والہ و شیدا رہے اور جب حاجی صاحب نے اس دنیا سے انتقال فرمایا تو سال میں دو مرتبہ خصوصی طور پر حاجی صاحب کے مزار پر چادر چڑھانے جاتے تھے۔ جب چادر لے کر چلتے تو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ دو آدمی ان کو سنبھالتے ہوئے چلتے تھے۔ بے خودی کے عالم میں ایک بار ایسی حالت طاری ہوئی کہ منہ سے خون جاری ہو گیا اور تمام راستے بہتا رہا لیکن ان کو احساس تک نہیں ہوا۔ چادر چڑھانے کے بعد ان کی حالت مردے کی سی ہو جاتی، گھنٹوں ہوا دی جاتی، گلاب سونگھایا جاتا تب کہیں جا کر ہوش و حواس میں آتے تھے۔ واقف اسرارِ عشق حاجی وارث علی شاہؒ نے حافظ پیاری صاحب کو حسنِ ازلی و جمالِ لافانی کا جو جلوہ مثلِ تجلی طُور دکھایا تھا اس نے حافظ پیاری صاحب کو کشش مجازی سے آزاد اور رنگ و روپ سے بیگانہ کر دیا تھا۔

www.ksars.org

پروفیسر فقیر محمد شیخ

روشن چراغ

خانقاہ عظیمیہ، حضور قلندر بابااولیابانی سلسلہ عظیمیہ کی ابدی آرام گاہ شادمان ٹاؤن نارتھ کراچی نہایت تیزی اور دل آویزی کے ساتھ مرجع خلائق بنتی جارہی ہے۔ عموماً سہ پہر کے بعد روزانہ یہاں معتقدین اور متوسلین جمع ہوتے اور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ جن خوش نصیب عقیدت مندوں نے اس بارگاہ عالیہ کی حاضری کی سعادت کو اپنا معمول بنالیا ہے، وہ تو حقیقتِ حال سے واقف ہیں تاہم اگر کوئی نووارد بھی وہاں کسی شام زیارت و فاتحہ کی نیت سے چند لمحے گزارے تو اسے ایک سرو قامت شخصیت اپنے ارد گرد ضرور نظر آئے گی۔ اس میں جمعرات جمعہ اور عام تعطیلات کی تخصیص نہیں کیوں کہ ان دنوں میں لوگ عموماً مزارات اور مقدس مقامات کی زیارت کو جاتے رہتے ہیں۔ یہ روزمرہ کی بات ہے کہ ہر شام ایک جوان سائیکل پر سوار تیزی کے ساتھ خانقاہ کی حدود میں داخل ہوتا ہے اور اسی مستعدی کے ساتھ اپنے ہمراہ لائے ہوئے پھول وغیرہ قریبی حجرہ میں رکھ کر مسکراتے چہرہ اور کشادہ ہاتھوں سے حاضرین کو خوش آمدید کہتے اور سلام کرتے ہوئے روزانہ کے معمولات میں مصروف ہو جاتا ہے۔ عمر چالیس سے اوپر، مضبوط، کمان کی طرح سیدھا جسم، سیاہ گھنے تراشے بال، قد کاٹھ دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ عمر کی رفتار اور موسم کے گرم و سرد اثرات اس کی شخصیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ 25، 30 سال کے نوجوان اس کی توانائی اور مستعدی کے آگے ماند نظر آتے ہیں۔ صفائی، ستھرائی، حاضرین کی خاطر تواضع اور دیگر کاموں میں مسلسل مصروف رہنے والا یہ شخص ہر ایک کی نگاہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔

اس معروف اور ہر دل آشنا شخصیت کا دوسرا نام سراج الدین احمد عظیمی ہے۔ دوست احباب صرف سراج ہی کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ مگر اکثریت انہیں سراج صاحب یا بھائی سراج کے نام سے پکارتی ہے۔ مگر سراج صاحب یا بھائی سراج اس سے بے نیاز ہیں کہ لوگ کس نام سے یاد کرتے ہیں، خدمت اور مسلسل خدمت ان کا نصب العین ہے اور وہ اس میں

www.ksars.org

کسی قسم کی کوتاہی کے روادار نہیں۔ سراج احمد عظیمی کو ہم بھی پیار سے سراج کہتے ہیں۔ یہاں ہم اسی مختصر اور جاذب توجہ نام والے سراج کی بے لوث خدمات کے متعلق چند حقائق پیش کرنا چاہتے ہیں۔

حضور قلندر باباؒ اولیا کی حیات میں جس طرح سراج آپ کی خدمت اور خبر گیری میں پیش پیش اور بے مثال تھے، آپ کے وصال کے بعد بھی اسی لگن اور باقاعدگی کے ساتھ حضور کے آستانے پر روزانہ حاضری فرض سمجھتے ہیں۔ خدمت اور جاں سپاری کے اب بھی وہی انداز ہیں جو حضور والا کے جیتے جی تھے۔ حضور قبلہ قلندر بابا سراج کی روح و قلب میں اب بھی سمائے ہوئے ہیں۔ سراج کے نزدیک زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں۔ موت و زیست کی گتھی ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ حضور کو آج بھی اس جذبہ واحترام سے یاد کرتے ہیں گویا حضور ان کی نظروں کے سامنے زندہ سلامت موجود ہیں۔ یہ عرفان و رمز آگاہی ان اہل نصیب کا انعام اور صلہ ہے جن کی زندگی کا مقصد ہی اطاعت و خدمت گزاری ہے۔ جو اپنی ذات اور اہل و عیال کی فلاح و بہبود کو ثانوی حیثیت میں رکھ کر اپنے مخدوم و محبوب کی نگہداشت اور خدمت ہی کو فرضِ اولین قرار دیتے ہیں۔ گویا سراج نے خدمت و جاں فشانی کا معیار اور روپ ہی دوبالا کر دیا ہے۔

یہ (صلہ کی) بات ان ہی لوگوں کو ملتی ہے جوصاحب استقامت (صبر) ہیں اور جو صاحب نصیب ہیں۔ (القرآن)

حضور قلندر باباؒ اولیا کے درِ دولت پر سراج دو مرحلوں میں پہنچے۔ 1969ء میں ایک ملاقات کے دوران ڈاکٹر صاحب کی نظر سراج پر پڑی اور انہوں نے سراج کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ نہ جانے دونوں طرف کون سی مقناطیسی قوت کام کر رہی تھی کہ سراج اس کشش سے گریز نہ کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب سلسلہ عظیمیہ کے محترم اور صاحب اختیار بزرگ ہیں۔ آپ ان مقتدر اور مؤدب بزرگوں میں شامل ہیں جنہیں حضور قلندر باباؒ اولیاء سے بطور خاص فیض پہنچا ہے اور جنہوں نے اس مشن کو کامیابی سے آگے بڑھانے کا بارِ گراں سنبھال رکھا ہے۔ اُس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب D 1/7,1 پر ناظم آباد کراچی میں نیچے کی منزل پر مقیم تھے اور حضور قلندر باباؒ اولیاء کا قیام اوپر کی منزل میں تھا جو 14 سال کے شب و روز پر محیط ہے۔ بعد میں حضور باباصاحب برکات حیدری میں مستقل رہائش کے لئے تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی اندرون بین نگاہوں نے سراج کی شخصیت میں ذہنی اور طبعی صلاحیتوں کے جواہر ریزے یقیناً دیکھے ہوں گے جو نگہداشت اور تربیت کے بعد آگے چل کر خدمت و جاں سپاری کا اعلیٰ نمونہ بن سکتے تھے۔ ادھر سراج کے ذہن میں ان کی گھریلو ذمہ داریوں کا بار گراں

www.ksars.org

تھا جس نے انہیں مخمصے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ابتدائی چند وقفہ داری ملاقاتوں کے بعد ایک دن سراج کو مسلسل تین دن آنے کا حکم دیا۔ ڈاکٹر صاحب انہیں دم کرنا چاہتے تھے۔ سراج بتلاتے ہیں کہ پہلے ہی دم میں ڈاکٹر صاحب نے مجھے بے دم کر دیا۔

بالآخر خدمت گزاری اور حاضر باشی کے دوران وہ مقسوم ساعت آ ہی گئی جب حضور قلندر بابا کی بارگاہ میں سراج بطور خاص پیش کر دیئے گئے۔اور سراج روحانی دنیا کے رموز و نکات سے روشناس ہوگئے۔بس ایک مخصوص طرز تربیت تھی جو عالم درون میں کارفرما تھی۔ہاں اتنا تو سب نے مشاہدہ کیا کہ حضور کی خدمت میں رہ کر سراج کی طبیعت اور مزاج میں ایسی پختگی پیدا ہو چکی تھی کہ انہیں اپنے بندۂ بے دام ہونے کا احساس تک نہ ہوا اور نہ ہی وہ کبھی قلب ماہیت پر حیرت دبے چارگی کا شکار ہوئے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

سراج کی طبیعت میں اتنی نرمی اور سادگی اور مزاج میں اتنی لچک ہے کہ کبھی ان کے لب و لہجہ میں جھنجھلاہٹ اور تیزی و تندی دیکھنے میں نہ آئی، خواہ کوئی بات کتنی ہی گراں گزری ہو۔ان کی خاص ادا جو مشاہدے میں آئی، یہ ہے کہ سراج ہر گفتگو کے موقع پر اپنی آنکھیں اور دل و دماغ کو کھلا رکھتے ہیں۔ان کی طبیعت میں اخذ اور اثر پذیری کی اتنی صلاحیت موجود ہے کہ وہ اس گفتگو سے جس کا موضوع ان سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا، مفید طلب اور رہبری و ہدایت پر مبنی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔یہ صلاحیت محض خداداد عطیہ ہے۔ورنہ عام معنوں میں تعلیم یافتہ ہونا تو درکنار، وہ نیم خواندہ بھی نہیں ہیں۔یہ صاحبانِ نظر کا کمال ہے کہ وہ خاک کو بھی کیمیا بنا دیتے ہیں۔

کیمیائیست عجب بندگی پیر مغاں
خاکِ او گشتم و چندیں در جانم دادند

www.ksars.org

1970ء کا زمانہ پاکستان کے لئے نہایت صبر آزما تھا۔ عام بے چینی اور بے یقینی کا دور دورہ تھا۔ لوگ گھریلو اور ملکی معاملات میں اتنے زیادہ الجھے ہوئے تھے کہ انہیں گھر سے باہر نکلنے کا مشکل سے موقع ملتا یا حوصلہ ہوتا۔ مگر سراج نے طبیعت ہی جداگانہ پائی ہے۔ انہوں نے جب حیدری کا ارادہ کیا تو بلیک آؤٹ کی گھٹاٹوپ فضا یا سر پر منڈلاتے ہوئے خطرات کا عکس بھی اپنے دل و دماغ پر نہ پڑنے دیا۔ اس زمانہ میں سراج اپنے بال بچوں کے ساتھ کچہری روڈ کے انتہائی سرے پر ملازموں کے کوارٹر میں مقیم تھے اور اسی دُور دراز علاقہ سے حضور کی خدمت میں حاضر نہ ہوتے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک روز بلیک آؤٹ، سراج صاحب اپنی چارپائی سائیکل پر رکھے چلے آرہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے حضور کی خدمت میں روزانہ حاضری سراج کے لئے لازمی نہیں کی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ سراج کا خاندان سندھی ہوٹل، قاسم آباد میں ایک نیم تیار مکان میں اٹھ آیا۔ اس طرح کچہری روڈ کے مقابلہ میں حیدری تک کا فاصلہ تقریباً نصف ہوگیا۔ خدمات کی عمدگی، باقاعدگی اور حضور کی پسندیدگی کا تقاضا تھا کہ سراج وقت اور فاصلہ کی اس سہولت سے حقیقی طور پر مستفیض ہونے کے لئے اس حاصل شدہ فرصت کا وقت حضور کی خدمت میں صرف کریں۔

ایک شام حضور نے سراج سے دریافت کیا کہ پچھلی رہائش سے حیدری آنے اور اب سندھی ہوٹل سے آنے میں کتنا وقت کم ہوگیا۔ سراج نے جواب دیا، اب تقریباً نصف وقت رہ گیا ہے۔ حضور مسکرائے مگر سراج حضور کا مدعا نہ پاسکے۔ ایک ہفتہ کے ناغے بعد پھر وہی سوال، وہی جواب، سراج کی عدم فہمی۔ تیسرے ہفتے جب حضور نے وہی سوال دُہرایا تو اگرچہ سراج نے وہی جواب دیا مگر اس دفعہ وہ مطلب کی تہ تک پہنچ چکے تھے۔ زبان سے اقرار تو نہ کیا مگر دل میں ٹھان لی کہ اگلے روز سے حاضری روزانہ ہوگی اور پھر حضور کے وصال تک حاضری اور خدمت روزانہ کا معمول بن گئی۔ جذبۂ اطاعت کی فراوانی اور حضور کی قربت کے نشے سے سرشاری کا یہ عالم ہے کہ سراج اب تک تقریباً روزانہ ہی مزارِ اقدس پر حاضری دیتے اور ہر جہت سے خدمت بجالانے میں مسرت اور فخر محسوس کرتے ہیں۔

جس تندہی، جاں فشانی اور انتہائے عقیدت و احترام کے ساتھ سراج نے حضور قلندر بابا کی خدمت کی ہے، اس کا تصور تو کسی حد تک کیا جاسکتا ہے مگر لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ والدین میں ماں کی محبت اور خدمت ضرب المثل ہے۔ ماں بھی جذبۂ ماتا کے تحت عمر کے ایک خاص مقام تک اپنے جگر گوشہ کی خدمت کرتی ہے مگر اس کے بعد جیسے جیسے بچہ شعور

www.ksars.org

حاصل کرتا جاتا ہے، ماں بتدریج اپنے آپ کو علیحدہ کرتی جاتی ہے۔ ابھی بلوغ کی منزل وارد ہوئی ہے کہ وہی لختِ جگر جو اپنی ماں کی آنکھ کا تارا تھا اور جس کی معمولی سی تکلیف سے ماں کی نیند اڑ جاتی تھی، کم سنی میں ماں کی ڈانٹ ڈپٹ اور کرخت لہجہ میں گفتگو کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر سراج نے خدمت کے اس معیار کو بھی مات دے دی۔ حضور کی چاہت اور شفقت بھی قابلِ رشک تھی۔ گھر کے سودا سلف کی فراہمی اور کپڑوں کی دھلائی صفائی عام بات تھی۔ اس پر مستزاد سہ پہر کے 5-6 بجے سے رات کے گیارہ بجے تک سراج حضور کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ سراج کو گھر کی نگہداشت اور فکرِ معاش کے لئے کتنا وقت ملتا تھا۔ عقل عاجز اور درماندہ ہے کہ اس جذبۂ سپردگی اور حوصلۂ تسلیم و رضا کا احاطہ کس طرح کرے۔

سراج کا معمول تھا کہ روزانہ 5 اور 6 بجے کے درمیان حیدری پہنچ جاتے تھے۔ سائیکل ساتھ والے مکان میں رکھ کر اور سودا سلف درونِ خانہ حوالہ کر کے ہنستے مسکراتے تیز قدموں سے چل کر حضور اور حاضرین کو سلام کرتے اور قدموں کی طرف فرش پر بیٹھ جاتے تھے۔ اس وقت معتقدین اور احباب بھی ایک ایک کر کے جمع ہو جاتے اور گفتگو کا سلسلہ چل نکلتا۔ حضور کا معمول تھا کہ ہر آنے والے کو بیٹھنے کے ساتھ چائے کی پیالی پیش کرنے کا حکم دیتے اور سراج لپک کر اس کی تعمیل کرتے۔

دورانِ گفتگو دلچسپی کے ساتھ سنتے مگر مداخلت نہ کرتے۔ تاہم ذہن برابر مفید مطلب نکات کی تلاش میں لگا رہتا تھا۔ حضور کا یہی اندازِ تعلیم اور طریقِ افہام تھا کہ حاضرین توجہ سے گفتگو سنیں اور اپنا مطلب و مدعا بیان کئے بغیر اپنے مسئلہ کا حل معلوم کر لیں۔ حضور باباصاحبؒ شاذ و نادر ہی کسی نجی معاملہ پر ضرورت مند سے براہ راست مخاطب ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ہر حاضر باش کوئی نہ کوئی دینی، دنیاوی، خاندانی یا معاشی ضرورت ذہن میں رکھتا تھا۔ باباصاحب ہر ایک کے دلِ اضطراب یا احتیاج سے باخبر ہوتے تھے۔ گفتگو کسی نہج سے ہو یا موضوع خواہ کچھ ہو، حضور کے ارشادات میں موضوع گفتگو سے گریز کے بغیر ایسے نکات اور اشارات شامل ہوتے تھے جن سے ہر ضرورت مند کے مسئلے کا حل ضرور نکل آتا تھا۔

www.ksars.org

عرض یہ کرنا ہے کہ دوران گفتگو سراج بھی حاضرین مجلس کا ایک رکن ہوتے تھے۔ اور ضرورت کی ہر چیز مہیا کرنے کے لئے گوش بر آواز رہتے تھے۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد حضورؒ جب لیٹنے کا ارادہ کرتے تو سراج بستر تکیہ درست کر کے ہلکے ہاتھوں اور ایک خاص rhythm متوازن اتار چڑھاؤ کے ساتھ حضورؒ کے ہاتھ پاؤں کمر دباتے یہاں تک کہ حضور سراج کو گھر جانے کی اجازت دیتے یا اٹھ بیٹھتے اور پھر ہلکی پھلکی بات چیت چل نکلتی۔ کبھی کبھی سراج سے کہتے ''حقہ پلاؤ۔'' یہ حقہ کیا تھا؟ سراج کا پسندیدہ، تیز عام معیار کا K2 سگریٹ۔ اسی سگریٹ کے چند ابتدائی کش لے کر سگریٹ سراج کو واپس کر دیتے۔ سگریٹ حضور کے لب کے لمس لے کر اب سراج کے ہونٹوں میں ہوتا۔ سراج آنکھوں کی چمک اور عجیب سرور آمیز کیف یا کیف آمیز سرور کے ساتھ وہ سگریٹ ختم کرتے اور حضور کی اجازت سے گھر واپس ہوتے۔ یہ اعزاز اور شفقت سراج کے علاوہ شاید ہی کسی اور کا نصیب رہا ہو۔

مے پرستی کا مزہ جب ہے کہ ساقی کہہ اٹھے
مے میں وہ مستی کہاں جو میرے مستانہ میں ہے

یہ سلسلہ اور معمول مہینوں بلکہ سالوں پر محیط رہا۔ وسط 1977ء سے حضور بابا صاحبؒ کی صحت میں اضمحلال کے آثار شروع ہوئے مگر حضورؒ نے اپنے معمولات میں فرق نہ محسوس ہونے دیا، رفتہ رفتہ اس کمزوری نے بیماری کی شکل اختیار کر لی اور علاج شروع ہو گیا۔ طبیعت کا اتار چڑھاؤ جاری رہا مگر مکمل صحت یابی کے آثار پیدا نہ ہو سکے۔ کم و بیش یہی کیفیت وسط 1978ء تک رہی۔ اب سراج کی ذمہ داری اور فکر مندی بھی بڑھ گئی اور اسی کے ساتھ خدمت کی مقدار بھی۔ معلوم ہوتا ہے قضا و قدر نے پہلے ہی سے اپنے ارادہ اور مشیت سے حضورؒ کو آگاہ کر دیا تھا جسے حضورؒ نے برضا و رغبت تسلیم بھی کر لیا تھا۔ ان کے مشن کی ترویج و تکمیل میں جمود پیدا ہو چلا تھا، ہو سکتا ہے کہ اس صورت حال سے متاثر ہو کر حضور نے اس مادی دنیا میں قیام کو ضروری نہ سمجھا ہو۔ بہر حال یہ ایک نکتۂ فکر ہے۔ اصل حقیقت سے اللہ تعالیٰ اور حضور قلندر بابا ہی آگاہ ہیں۔

اصل بیماری کو نہ تو کوئی سمجھ سکا اور نہ ہی حضور نے کبھی اسے ظاہر ہونے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔ حضور نے محض بہی خواہوں کی دل جوئی کی خاطر اپنے آپ کو ہر قسم کے علاج کے لئے پیش کر دیا۔ معالج جو بھی علاج اور پرہیز

www.ksars.org

تجویز کرتے وہ اسی پر عمل شروع کردیتے۔ مگر بیماری تھی کہ مستقل ہوتی گئی۔ جون 1978ء تک کمزوری کے باعث اکثر لیٹے رہتے اور اسی حالت میں لوگوں کو حاضری کا موقع دیتے۔ ورنہ اس سے ڈیڑھ سال پہلے تک قدرتی عمر رسیدہ ہونے اور بعد میں بیماری میں مبتلا ہوجانے کے باوجود حضور قلندر بابااولیاءسہ پہر سے رات کے دس گیارہ بجے تک مستقل بیٹھے رہتے اور اسی توجہ سے لوگوں کے مسائل سنتے تھے مگر اب حالات بتدریج نئی تردد انگیز شکل اختیار کر رہے تھے۔ کھانے پینے میں تکلیف بڑھ گئی تو معالجین اور ماہرین نے گلے کے کینسر کا شبہ ظاہر کیا۔ حضورؒ کی عدم صحت کی یہ آخری تشخیص تھی اور اس سلسلے کا ہر علاج آخری اور ناکام ثابت ہوا۔

حضور قلندر بابا کی خدمت و جاں نثاری کا جتنا صبر آزما اور ہمت طلب یہ دور تھا۔ اسی نسبت سے سراج نے اپنی ذہنی اور روحانی تربیت اور وابستگی کے طفیل اس گراں بہا فرض کو اپنے اوپر آسان کرلیا۔ خیال فرمایئے کہ شام کی حاضری مستقل طور پر جاری ہے۔ اور وہاں سے فارغ ہو کر رات کے دو ڈھائی بجے پھر حاضر ہونا ہے۔ مگر آفرین ہے سراج کی ہمت اور حضورؒ کے ساتھ وابستگی، محبت اور وارفتگی کے جذبہ پر کہ انہوں نے پیشانی پر بل آنے کا خیال تک نہ آنے دیا۔ حضورؒ نے شوال سے اگلے ماہ صفر تک کا زمانہ درد و کرب سے گزارا۔ ملنے والوں اور عقیدت مندوں سے گزارش کی گئی کہ انتہائی ضرورت کے سوا حضورؒ سے مخاطب نہ ہوں۔ گھر والوں کے علاوہ اگر کوئی شخص وہاں موجود ہو سکتا تھا تو وہ سراج تھے جو اب زیادہ سے زیادہ وقت حضورؒ کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔ سچ پوچھئے تو اس نازک ترین دور میں گھر والوں سے زیادہ سراج کی ضرورت تھی کہ وہی حضورؒ کو گود میں لے کر جہاں حکم ہوتا لے جاتے۔ ان کے علاوہ نہ کسی میں اتنی ہمت تھی اور نہ اجازت۔ دم واپسیں تک سراج نے اپنی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ایسی خدمات اور اتنی باقاعدگی اور جمع خاطر کے ساتھ کہ فرشتوں کو بھی رشک آئے۔ جس جسمِ اطہر کو اپنے بازوؤں میں لینے کی سعادت سراج کو حاصل ہوئی اسی جسم اطہر کے نورانی مظہر کو ملائکہ مقربین لئے پھرتے ہیں۔ سراج نے حضور قلندر بابااولیاء کی بارگاہ میں جو نذرانۂ دل و جاں پیش کیا اور جس پیار و شفقت سے اُسے حضورؒ نے قبول بھی فرمالیا اس کی حقیقت تک رسائی ان ہی حضرات کے لئے ممکن ہے جو دریائے شہود کے شناور ہیں۔ جو لوگ سراج کی نجی زندگی اور گوناگوں ذمہ داریوں کا علم

www.ksars.org

رکھتے ہیں وہ محض مادی حیثیت سے ہی اس قربانی اور جاں سپاری کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ معاشی اور خانگی الجھنیں انہیں پہلے بھی پیش آتی تھیں اور اب بھی آتی رہتی ہیں مگر سراج کے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہیں ہوئی۔

سراج زندہ دل ہیں اور خوش وقتی کے دل دادہ ہیں لیکن انہوں نے قلندر بابا اور آپ سے وابستہ تمام امور کو اولیت دے رکھی ہے۔ انہیں ذاتی آسائش اور تکمیل خواہش کی فکر فرض کی ادائیگی کے مقابلے میں دامن گیر نہیں ہوتی۔

در رہِ محمل لیلی کہ خطر ہاست بسے
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

مقام شکر ہے کہ سراج نے حضور قلندر بابا اولیاء کی خدمت واطاعت کے راستے میں جو اول قدم اٹھایا تھا۔ انہوں نے خطر ہائے گوناگوں کو خاطر میں لائے بغیر، جنون عشق کی کٹھن مسافت طے کرتے ہوئے منزلِ مراد کو حاصل کر لیا ہے۔
سراج بجاطور پر اپنی لازوال قربانی اور بے مثال کامیابی پر قابل مبارکباد ہیں۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

ان کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ وہ اس بیماری کو روحانی قوتوں سے ختم کردیں۔ فرمایا:

"میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت دی ہے کہ میں عوام کی طرح دنیا میں رہوں، عوام کی طرح علاج کراؤں اور عوام کی طرح نقل مکانی کروں۔"

وصال سے ایک گھنٹہ قبل بھائی سراج صاحب نے جانے کی اجازت چاہی، فرمایا: اچھا جاؤ، خدا حافظ، صبح جلد آجانا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ بھائی سراج صاحب نے پیر و مرشد کا حق خدمت ادا کر دیا۔ قبلہ خواجہ صاحب اور چند دوسرے متوسلین حضرات کی موجودگی میں ایک بار جنت کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ قبلہ حضورؒ نے فرمایا،

میں نے ایک دھوبی کی پیشانی پر جنت کی مہر دیکھی ہے، یہ دھوبی سراج صاحب ہیں۔

www.ksars.org

بی بی انورادھا

پروانہ

چاروں طرف گھنے درخت تھے۔پتوّں سے چھن کر آنے والی سورج کی نارنجی دھاروں نے مکان کے گرد سحر انگیز ہالہ بنا دیا تھا۔پرندے دن کو خیر باد کہہ کر آشیانوں کو لوٹ آئے تھے اور شاخوں پر بیٹھ کر مستی میں شام کا گیت گا رہے تھے جب کہ غذا کی تلاش میں بلوں سے باہر آنے والے حشرات الارض اپنی آواز میں رات کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔شام کے حسنِ جہاں خیز کو چھپانے کے لئے گہرے نیلے آسمان پر سیاہ بدلیاں چھا گئیں اور تھوڑی دیر میں بوندوں کی برسات ہو گئی۔ ٹپ ٹپ کے ترنم میں آوازیں کیا خاموش ہوئیں کہ بَن میں بوندیں ساز بن گئیں۔

میں کرسی کھینچ کر برآمدے کے آخری سرے پر لائی اور منظر جذب کرنے کی کوشش کی۔پھر ہتھیلی کھلی فضا کی طرف بڑھا دی تاکہ ابرِ باراں کا لمس محسوس ہو اور خلیات کی پیاس بجھے۔

ماحول پرُاسرار مگر خوش گوار تھا۔اطمینانِ قلب کی کوشش کی ضرورت نہیں تھی کہ پانی نہیں، سکون کی بوندیں برس رہی تھیں۔مناظر فطرت کا ہر عنصر ہماری تسکین و تکمیل کے لئے تخلیق کیا گیا ہے بشرطیکہ ہم ان میں چھپی ہوئی تفصیل پڑھنے کی کوشش کریں۔بارش ہر نوع کو اس لئے تسکین دیتی ہے کہ نوعیں پانی سے تخلیق ہوئی ہیں۔پانی جب بارش کے پانی سے ملتا ہے تو وصل کا تقاضا بڑھ جاتا ہے۔

بادل برس کر خاموش ہو گئے تھے مگر چاند اب تک بدلیوں میں چھپا ہوا تھا۔گہرے بادلوں میں رخِ روشن کی دید کے آثار نہیں تھے اس لئے رات تاریک ہونے سے پہلے تاریک نظر آ رہی تھی۔گھنے درختوں کے درمیان یہ مکان اندھیرے میں

www.ksars.org

ڈوبا ہوا تھا۔ تاریکی پھیلتے ہی سڑک کے کنارے لگے ہوئے بلب جل اٹھے۔ کچھ دیر میں چھوٹے بڑے کیڑے روشنی کے چاروں طرف اڑتے ہوئے نظر آئے —— یہ پروانے تھے۔

پروانوں کی کئی اقسام ہیں۔ کچھ دن میں جاگتے ہیں، باقی رات کے راہی ہیں۔ تاریکی میں جہاں کہیں روشنی نظر آتی ہے، خود سے بے خود ہو کر اس جانب لپکتے ہیں اور جب تک موت نہ آئے، روشنی کے ہالے سے نہیں نکلتے۔

انہماک گہرا ہوا تو پروانوں کو بلب کے شیشے سے ٹکراتے اور قربان ہوتے دیکھا۔ وہ شیشے کے اندر موجود روشنی میں جذب ہونا چاہتے تھے لیکن شیشہ راہ میں رکاوٹ بن گیا تھا۔ اس کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔ ملن کی چاہ میں ہر پروانے نے روشنی کی جان کو اپنی جان پر ترجیح دی۔ وارفتگی بتا رہی تھی کہ پروانے جانتے ہیں،

''جان جب جان سے ملتی ہے تو جان میں جان آتی ہے۔''

پروانوں کی موت میرے لئے معمہ تھی۔ وہ بلب سے ٹکرائے تھے، روشنی تک نہیں پہنچے۔ منزل پر پہنچنے سے پہلے جان کی بازی ہار گئے۔ اگر ان کو منزل نہیں ملی پھر موت کیا ہوئی؟

بانگِ درا میں حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے پروانے اور شمع کے تعلق کو موتی کی طرح لڑی میں پرو کر خوب صورت نذرانہ پیش کیا ہے۔

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں
یہ جان بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں
سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا اسے
آداب عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے
کرتا ہے یہ طواف تیری جلوہ گاہ کا
پھونکا ہوا ہے کیا تیری برقِ نگاہ کا
آزار موت میں اسے آرام جاں ہے کیا

www.ksars.org

شعلے میں تیرے زندگیِ جاوداں ہے کیا
غم خانۂ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو
اس تفتہ دل کا نخلِ تمنا ہرا نہ ہو
گرنا تیرے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذتِ سوز و گداز ہے
کچھ اس میں جوش عاشق حسن قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے

پروانہ، اور ذوق تماشائے روشنی
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

ذہن پر زور دینے سے عقدہ کھلا کہ پروانے جانتے ہیں وہ شیشے سے ٹکرا رہے ہیں اور روشنی اندر ہے۔ان کو معلوم ہے کہ شیشے میں حرارت روشنی کا ہی لمس ہے۔وہ مادی لباس کے ساتھ روشنی میں جذب نہیں ہو سکتے اس لئے انہوں نے اس جہاں میں شیشے کی معرفت روشنی کی حرارت محسوس کی اور اسی حالت میں جان دی۔یعنی پروانوں نے روشنی کا لمس ملتے ہی قفس عنصری چھوڑ دیا تاکہ روشنی کے جہاں میں رکاوٹ کے بغیر روشنی سے ملاقات ہو۔

پروانوں کی جدوجہد دیکھ کر ذہن میں اپنی فلم نشر ہوگئی۔میں بھی پروانہ ہوں جو اپنے روحانی استاد کی روشنی پانا چاہتا ہے۔اس کوشش کی ابتدا میں مادی چیزوں کا سہارا لیا۔کبھی خط لکھا اور کبھی بالمشافہ ملاقات کا انتظار کیا۔نتیجہ وہی رہا جو پروانے کا ہے۔پروانہ ابتدا میں شیشے کو روشنی سمجھ کر دیوانہ وار آگے بڑھتا ہے اور ٹکرا ٹکرا کر خود کو زخمی کر لیتا ہے۔اس جہد و جہد میں جز وقتی خوشی ملتی ہے مگر خوشی کی تکمیل نہیں ہوتی۔پروانے کی طرح میں نے ظاہری وسائل کو روشنی تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھ لیا۔ایک عرصہ خود کو زخمی کرنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ یہ اسباب کی دنیا ہے جہاں ہر شے معاشرتی قوانین میں بندھی ہوئی ہے اور ان قوانین پر اسپیس کی گرفت ہے۔

www.ksars.org

مثال کے طور پر روحانی استاد سے ملنے کے لئے مجھے ذرائع آمد و رفت کے وسائل کے علاوہ قوانین کی پاسداری کے ساتھ ہوائی و زمینی سفر کی پابندیوں سے گزرنا ہے۔ ویزا کی درخواست دینی ہے، درخواست جانچ پڑتال سے گزرے گی، منظور ہوتی ہے یا نہیں، یہ بھی مرحلہ ہے۔ پھر امیگریشن کے کاؤنٹر سے گزرنا اور اس کے بعد فضائی سفر۔ اس طریقِ کار میں ہر مرحلے پر پابندی کی وجہ سے آزادی کھو جاتی ہے۔

نشیب و فراز سے گزر کر جب میں تھک گئی تو روشن لہروں نے سمجھایا کہ مرشد اور مرید کی اصل ملاقات دل میں ہوتی ہے۔ جب مرید اسباق پر عمل کرتا ہے تو مرشد سے قریب ہو جاتا ہے پھر ملاقات میں وقت حائل ہوتا ہے اور نہ فاصلہ رہتا ہے۔

اپنی جہدِ حیات کا پروانے سے موازنہ کیا تو انکشاف ہوا کہ شیشے سے مسلسل ٹکرانے کے بعد جب پروانے پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ میں مادی شے سے ٹکرا رہا ہوں تو وہ شیشے سے ذہن ہٹا کر اندر موجود روشنی پر توجہ مرکوز کر دیتا ہے اور جب اگلی مرتبہ ٹکراتا ہے تو روشنی کی حرارت محسوس کر کے جان قربان کر دیتا ہے۔ پروانہ اس وقت تک نہیں مرتا جب تک روشنی کا لمس نہ مل جائے۔ بلب سے ٹکرانا لاحاصل ہے، اس روشنی پر نگاہ مرکوز رکھنی ہے جس سے فضا روشن ہے۔

خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کنکشن منقطع ہونے سے بجلی چلی گئی۔ مکان سمیت پورا علاقہ مصنوعی روشنی سے محروم ہو گیا۔ ہمیں قبل از وقت اطلاع دی گئی تھی کہ بجلی جانے کا امکان ہے اس لئے ہم نے موم بتیاں قریب رکھی تھیں۔ میں نے بڑی سفید موم بتی جلائی۔ میرے اطراف روشنی کا ہالہ بکھر گیا۔ کہیں روشنی کم تھی، کہیں زیادہ، کہیں بہت زیادہ اور کہیں بہت کم۔

آنکھیں موم بتی پر مرکوز ہو گئیں۔ موم بتی کا جسم ساکن تھا، لَو حرکت میں تھی جس کی حرارت سے موم بتی کی زندگی پگھل رہی تھی۔

پگھلتے ہوئے موم سے ماضی کے جھروکے روشن ہوئے۔ جب میں چھوٹی تھی تو لَو کی حرارت سے ٹپکتی ہوئی موم میری توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی۔ میں مسرت میں گاتی اور تالیاں بجاتی تو دیوار پر بننے والا لَو کا عکس میرے گیتوں کے ساتھ رقص کرتا

www.ksars.org

تھا۔اکثر ایسا بھی ہوتا کہ میں گرنے والے قطرے اٹھاتی جن میں گرمائش موجود ہوتی تھی،ان سے موم کے پھول اور پتّے بناتی اور پھر انہیں لَو کے قریب رکھ کر پگھلنے کا تماشا دیکھتی۔موم اور شعلے کا ملن مسحور کر دیتا۔اپنے قیام کے لئے دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔کچھ وقت ایک دوسرے سے دور رہنے کے بعد،جس کو دنیا کی زبان میں زندگی گزارنا کہتے ہیں،دونوں ملتے اور فنا ہو جاتے۔تعجب ہوا کہ ہم دنیا کے لوگ دوری کو زندگی کہتے ہیں اور قرب کو دوری سمجھتے ہیں۔خیالات میں ترتیب قائم ہونے لگی اور مرشد کا بتایا ہوا سبق یادداشت کے خانوں سے نمودار ہوا،

''ہم یہ فنا ہوجانے والا جسم نہیں بلکہ ہماری اصل روح ہے جو جسم کو چلارہی ہے۔''

تفکر نے بتایا کہ جہانِ رنگ و بو میں رہنے کے لئے روح (لَو میں حرارت) اور جسم (موم) کو کچھ وقت کے لئے ساتھ رہنا ہوگا۔مٹی کے جسم کی مثال موم کی ہے۔حیات و زیست کا دور پگھلتے ہوئے موم جیسا ہے جو چاہے کتنی شکلوں میں ڈھل جائے،مقدر بالآخر پگھلنا ہے۔

بلب روشن تھے تو پروانے بلب کے گرد گھوم رہے تھے۔موم بتی جلاتے ہی پروانوں نے اپنا رخ تبدیل کیا اور لَو کے گرد گھومنے لگے۔عقل انہیں شعلے سے دور رہنے کے لئے خبردار کرنا چاہتی تھی جب کہ دل ان کی تڑپ کو محسوس کر رہا تھا۔دل نے کہا،ان کو روکو مت،جلنے دو کہ ہر ایک کو اپنا سبق خود سیکھنا ہے۔روشنی نے پروانوں کو مسحور کر لیا تھا۔اب ان کے لئے اندھیرے میں لوٹنا ممکن نہ تھا۔اس خیال کے آتے ہی دل گداز ہو گیا۔کیا روحانی مسافر کی مثال پروانے جیسی نہیں؟ایک مرتبہ روشنی نظر آجائے پھر وہ اندھیرے سے منہ موڑ لیتا ہے اور دنیا کو دوبارہ اس نظر سے نہیں دیکھنا چاہتا جو فریبِ نظر ہے۔مسافر روشنی میں فنا ہونے کی تمنا رکھتا ہے جیسے پروانہ شمع پر جاں نثار ہے۔

اس سے قبل کہ پلکیں جھپکتیں،ایک پروانہ اڑتا ہوا آیا اور بلاخوف وخطر موم بتی کے شعلے میں اتر گیا——آواز آئی——لَو تیز ہوئی جس کے بعد پروانے کا نام ونشاں نہ تھا۔دل گداز ہو گیا۔اس لئے نہیں کہ پروانے نے جان دے دی بلکہ اس خیال پر کہ اس کو منزل مل گئی،وہ جہاں سے آیا تھا،وہاں لوٹ گیا۔

اگلے لمحے جس خیال نے دستک دی،اس نے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا،پروانے نے جب شمع دیکھی تو پھر کسی اور کو نہیں دیکھا۔وہ یک سُو ہو گیا۔پروانے کی سی یکسوئی میرے اندر کیوں نہیں؟اس کا ذہن روشنی پر مرتکز ہو گیا کہ شعلے کے قریب

www.ksars.org

آنے کا خیال نہیں آیا۔ وہ کیا جذبہ تھا کہ اس نے شعلے اور خود میں فرق محسوس نہیں کیا اور دونوں ایک جان ہو گئے۔ ایک میں ہوں، ظاہری دنیا اور فریبِ نظر میں مبتلا کہ ذہن روشنی کو پانا چاہتا ہے مگر پروانے جیسا گداز نہیں تھا۔

پروانے نے زندگی کا اہم سبق سکھایا۔ اس راہ میں کامیابی کا طریقہ کثرت سے ذہن ہٹا کر خود کو روشنی میں مرکوز کرنا ہے۔ اتنی دیر میں بجلی بحال ہو گئی۔ گھر اور اطراف میں موجود بلب جل اٹھے۔ میں نے پھونک مار کر موم بتی بجھادی۔ پروانوں نے رخ بدلا اور ایک بار پھر بلب کی طرف بڑھ گئے۔ روشنی دیکھنے کے بعد ان کو کسی صورت اندھیرا قبول نہیں تھا۔ پروانوں کا منظر دیکھ رہی تھی کہ ان کے گرد اڑنے والی کوئی شے نظر آئی۔ یہ چمگادڑ تھے جو نہ جانے کہاں سے آئے اور ان کو کھانا شروع کر دیا۔

دل میں درد کی لہر اٹھی آہ، بد قسمت پروانے۔ خیال آیا کہ جب ہم روشنی کے قریب ہوتے ہیں تو منفی خیالات ہمیں اسی طرح جکڑ لیتے ہیں جیسے چمگادڑوں نے پروانوں کو۔ جو پروانے بلب کے قریب تھے، وہ نمایاں ہونے کی وجہ سے شکار ہو گئے۔ ایسے ہی منفی قوتیں روشنی کے قریب پہنچنے والوں کے دلوں میں شک ڈال کر ان کو شکار کرتی ہیں۔ میں نے چمگادڑوں کو منفی سوچ سے تشبیہ دی جو ہمارے اندر موجود ہوتی ہے اور روشنی سے بھٹکا کر تاریکی میں لانے کی کوشش کرتی ہے۔ لاشعور نے متوجہ کیا،

۱۔ چمگادڑوں نے ان پروانوں کو لقمہ کیوں نہیں بنایا جو موم بتی کے گرد گھوم رہے تھے؟
۲۔ صرف وہ پروانے شکار کیوں بنے جو بلب کے گرد جمع تھے؟

آگہی نے کہا، شعلے کا مطلب بلاواسطہ روشنی اور بلب بالواسطہ روشنی ہے۔ چمگادڑ جانتے تھے کہ اگر وہ شعلے کے قریب گئے تو انجام کیا ہوگا۔ دل نے سرگوشی کی، جب روشنی کے مسافر کو یکسوئی حاصل ہو جائے تو اللہ کے حکم سے اسے کوئی شے نقصان نہیں پہنچا سکتی، منفی سوچ بے اثر ہو جاتی ہے۔ وہ ایک مرکز پر یکسو ہو جاتا ہے اس لئے جیسے ہی منفی سوچ سر اٹھاتی ہے، روحانی استاد کی شفیق لہریں منفی لہروں کو تحلیل کر دیتی ہیں۔ یہ استاد ہے جو محبت کی لہروں کے ذریعے شاگرد کو تاریکی میں واپس جانے سے روکتا ہے۔ میں نے نم آنکھوں سے دل کو مخاطب کیا،

www.ksars.org

انشاءاللہ ایک دن تم دیکھو گے کہ ہم اس راستے میں پتھر سے موتی بن گئے۔ میں اور تم ایک راہ کے مسافر اور ایک منزل کے متمنی ہیں۔ دونوں محبت کے اس سمندر کی لہریں ہیں جو ہمارے استاد کے دل میں ٹھاٹھیں مار رہی ہے اور تب تک اے دل، روشنی سے ملنے کی کوشش کرو اور مادی جسم (موم) کو خلقِ خدا کی خدمت میں پگھلا دو۔

www.ksars.org

عابد محمود

محبوب راکھ ہونے دیتا ہے اور نہ بجھنے دیتا ہے

طاہر کی دکان پر چائے پیتے ہوئے ہم دوست ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ زاہد جرمنی سے اور بابر کویت سے آیا تھا۔ سالوں بعد ہم اکٹھے ہوئے تھے۔ جب دونوں پردیس کی داستان سنا چکے تو ان کی توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا۔ سنا ہے تم یہاں پیر بن گئے ہو۔ بابر نے تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں مسکراہٹ کو نظر انداز نہیں کر سکا۔ بھائی! میں پیر کا ادنیٰ مرید ہوں اور محبوبیت کے آداب سیکھ رہا ہوں۔ بس جب اللہ کی خاص رحمت ہوتی ہے تو اپنے کسی بندے سے ملوا دیتا ہے۔

پردیس میں خبریں ملتی تھیں کہ لوگ تمہاری بہت عزت کرتے ہیں اور تم یہاں پر علاج معالجہ کرتے ہو، بابر تفتیشی انداز میں بولا۔ مرشد کریم خدمت خلق کرتے ہیں، جو علاج انہوں نے بتایا ہے، میں وہی علاج لوگوں کو بتاتا ہوں۔ اللہ کے فضل سے شفا ہوتی ہے، سب عطا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پردیس میں تمہارے بارے میں عجیب عجیب باتیں سننے کو ملتی تھیں کہ تم پیر بن گئے ہو اور اس سائنسی دور میں لوگوں کو تعویذ لکھ کر دیتے ہو۔

بھائی! تعویذ تعوذ سے مشتق ہے۔ اس کے معنی پناہ میں آنا ہے۔ میں تعویذ پر اللہ کا نام لکھ کر دیتا ہوں، لوگوں کو شفا ملتی ہے۔ کائنات اللہ نے تخلیق کی ہے اور تخلیق کائنات کے سامنے آدمی کی سائنس کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اس جواب پر وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے مزید کچھ نہیں کہا اور موضوع بدلتے ہوئے کویت کے حالات پوچھے۔

www.ksars.org

چائے پی کر ہم گاڑی کی طرف بڑھے تو گاڑی کے قریب دکان کے تھڑے پر ایک شخص کمبل اوڑھے بیٹھا تھا، بال مٹی میں اٹے ہوئے اور ہاتھ پیروں پر میل جما ہوا تھا۔ اس پر اچٹتی نگاہ ڈال کر گاڑی کا دروازہ کھولا تو اچانک چہرہ شناسا محسوس ہوا ۔ غور سے دیکھا تو دل کی حالت غیر ہوگئی۔ آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ یک دم ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہوگیا۔ ایسا لگا کہ مجھ پر منوں مٹی گر رہی ہے اور میں دفن ہو رہا ہوں۔

زاہد اور بابر نے ایک پاگل کو ادب سے کھڑے ہوتے دیکھ کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں ان کو نظر انداز کر کے جلدی سے گاڑی میں بیٹھا۔ دونوں چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے بے پروا، شہزاد کو اس حالت میں دیکھ کر ذہن میں ماضی کی فلم نشر ہوگئی۔

عاشق اور محبوب، وجود کے دو پرت عورت اور مرد کی طرح سکّے کے دو رخ ہیں۔ عشق و محبت کی داستانوں میں مجھے عاشق ہمیشہ مظلوم اور محبوب سنگدل لگا۔

میرے چچا کو اپنے پیر و مرشد سے والہانہ عشق تھا۔ چند دنوں کی جدائی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جب وہ پیر و مرشد کا نام سنتے تو آنسو چھلکنے کو بے تاب ہوتے اور وہ نشست چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے۔

میں اس وقت بچہ تھا، چچا کا حال دیکھ کر مجھے ان کے محبوب پر رشک ہونے لگتا۔

چچا چھٹی کے دن مرشد کی جھلک دیکھنے کے لئے 55 کلو میٹر دور ایمن آباد کے گاؤں کوٹ بھٹہ جاتے تھے، بسوں کے دھکے کھا کر وہ دو گھنٹے میں ایمن آباد پہنچتے، وہاں سے آٹھ کلو میٹر دور کوٹ بھٹہ پیدل سفر کرتے اور سورج ڈھلنے سے پہلے واپسی کے لئے روانہ ہو جاتے۔

چچا کا اپنے مرشد سے عشق دیکھ کر میں سوچتا تھا کہ محبوب کتنے آرام میں ہوتا ہے — عاشق قربانی اور ایثار کے جذبے سے سرشار پروانے کی طرح شمع کے گرد طواف کرتا ہے جب کہ محبوب خاموش ہے۔

www.ksars.org

قدرت کی رحمت سے جب مجھے مرشد ملے اور انہوں نے ناچیز کو تربیت میں لیا تو اس وقت میں عقل کے گھوڑے پر سوار تھا ۔عاشقوں کی طویل قطار دیکھتا اور مرشد کے لئے ان کے جذبات سنتا تو حیرت ہوتی۔ لگتا تھا کہ سارے مرید میرے چچا کی طرح دیوانے ہوتے ہیں۔ لوگ اندرون اور بیرون ملک نہ جانے کہاں کہاں سے محبوب کی ایک جھلک دیکھنے آتے تھے۔

میں سوچتا تھا کہ واہ! محبوب کی کیا شان ہوتی ہے، نہ کوئی دکھ نہ ہجر کی تکلیف، نہ کوئی دردنہ سفر کی صعوبت، بس اللہ نے محبوبیت دی اور لوگ دید کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں۔

نہ میں عاشق تھا نہ کسی کا محبوب، عشق کے جذبات کو کیسے سمجھتا۔ عاشقی کا دعویٰ کبھی تھا اور نہ ہے، بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ مقناطیس کی طرح سب کو کھینچتے ہیں۔ لوہے میں کہاں سکت کہ کھینچ سکے۔ اور میں نے تو اپنے اندر لوہے کے خواص بھی نہ دیکھے تھے۔ میرے تو نہ جانے کتنے ادوار لوہا بننے میں صرف ہونے تھے۔ البتہ ذہن میں نقش تھا کہ محبوب کے ناز الگ ہوتے ہیں اور پھر قدرت نے دکھایا کہ محبوب ہونا کیا ہوتا ہے۔ مرشد سے میرا تعلق محض علم کی حد تک تھا اور علمی ذوق کی تسکین ہو رہی تھی۔ عشق کے رمز نہیں جانتا تھا البتہ سب سے مرشد کی باتیں کرتا اور آنے جانے والوں کو ان کی تعلیمات بتاتا۔

مرشد کی باتیں سن کر شہزاد میرے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ بہت سمجھایا کہ یہ میری باتیں نہیں، جو روشنی تم تک پہنچی ہے وہ اس آفتاب کی ہے جس سے مجھ جیسی ہزاروں شمعیں روشن ہیں۔ جن کی باتیں ہیں تم کو ان سے عشق ہوا ہے، مجھ سے نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ عشق کے آداب کیا ہیں۔ میری حیثیت محض اسپیکر کی ہے، جو بات مجھ تک پہنچتی ہے، اہلِ ذوق تک پہنچا دیتا ہوں۔ شہزاد بولا، اگر میں آپ کا دیوانہ ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ یہ کہہ کر سر جھکا دیا۔ جب اس پر بات کا اثر نہیں ہوا اور سمجھانے کا کوئی طریقہ کامیاب نہ ہوا تو ایک دن میں نے اس کو پیار سے سمجھایا۔ دیکھو شہزاد! ذہنی مرکزیت ایسی ہستی سے وابستہ ہونی چاہئے جو اللہ کا دوست ہو۔ میں تمہیں کیا دے سکتا ہوں؟ میرے اندر ہزار خامیاں ہیں ۔ ویسے بھی اللہ کا قرب، اللہ کے دوستوں سے ملتا ہے۔ مجھے اپنا پتہ نہیں کہ کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں اور انجام کیا ہے،

وہ مسکرا دیا ، کہا کچھ نہیں۔

www.ksars.org

شدید دھند اور جاڑے کی سردی میں جب دانت سے دانت بج رہے تھے، میں گرم بستر میں میٹھی نیند سو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا تو دوسری طرف ہمارے ہمسائے شاہد صاحب تھے، آواز میں پریشانی تھی۔

ہیلو، شاہد صاحب، اس وقت؟ خیریت ہے؟ رات کا ایک بج رہا تھا۔

خیریت نہیں ہے۔ آپ کے گھر کے باہر کوئی چادر اوڑھے بیٹھا ہوا ہے، شاہد صاحب بولے۔ سخت سردی میں گھر کے باہر کون ہو سکتا ہے۔ بستر چھوڑ کر باہر کی طرف بڑھا۔ دروازے میں سوراخ سے دیکھا تو دھند میں گٹھڑی بنا ہوا ایک شخص نظر آیا۔ بیٹھنے کی نشست سے اندازہ ہوا کہ وہ شہزاد ہے۔ شدید جھٹکا لگا کہ یہ اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے۔ دروازہ کھول کر قریب گیا تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اندر آنے کو کہا اور سمجھایا کہ میرے بھائی! یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کیوں زندگی کو اپنے لئے مشکل بنا رہے ہو۔ وہ خاموش تھا۔ میں اس کے کھانے اور سونے کا انتظام کر کے کمرے میں آ گیا۔

شہزاد نے اس عمل کو معمول بنا لیا۔ روز رات کو باہر بیٹھ کر میرے گھر کی جانب تکتا رہتا تھا۔ میں پریشان ہو گیا کہ اس آدمی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس نے میری وجہ سے خود کو تکلیف میں ڈال دیا ہے۔ وہ باہر سردی میں ٹھٹھرتا تھا اور اس خیال سے اندر مجھے گرم بستر میں نیند نہیں آتی تھی۔ اس وقت احساس ہوا کہ محبوب بننا آسان نہیں۔ مجھ سے ایک دیوانہ نہیں سنبھالا جا رہا — میرے مرشد کریم ہزاروں پروانے کیسے سنبھالتے ہیں —؟

شدت سے محسوس ہوا کہ عاشق تو سوزِ دل پروانہ لیے رقصاں ہوتا ہے، اس کی دیوانگی سمجھ میں آتی ہے لیکن محبوب کو بھی شمع کی طرح جلنا پڑتا ہے۔ عاشق تکلیف میں ہوتا ہے تو محبوب بھی بے حس نہیں ہوتا، اس کو بھی نیند نہیں آتی۔ محبوب بننا آسان نہیں۔

میں مرشد کریم کے مشن کے لئے کام کرنا اور ان کی تعلیمات لوگوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ بہت لوگ اس راہ میں ہم سفر بنے۔ ہم نے مل کر اپنے عمل سے مرشد کی تعلیمات کو عام کرنے کی کوشش کی۔ البتہ شہزاد کے طرزِ عمل سے میری سرد مہری کا دور شروع ہوا اور میں آہستہ آہستہ کنارہ کش ہو گیا، پھر ملاقات نہیں ہوئی۔

www.ksars.org

وقت گزرتا رہا۔۔نہ جانے کب نظر کرم ہوئی اور میرے اندر لوہے کے خواص بیدار ہونا شروع ہو گئے — میں موصل بن کر مقناطیس کے حصار میں آ گیا۔ وہ تمام دھاتیں جن میں سے کرنٹ گزر سکتا ہے، موصل کہلاتی ہیں۔ جن دھاتوں میں سے کرنٹ نہیں گزرتا، ان کو غیر موصل کہتے ہیں۔ ایک کشش تھی جو خود سے بے خود کر کے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ نہ جانے پروانے کے سوز نے کہاں سے آ کر میرے دل میں بسیرا کر لیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ دل اس درد سے آشنا ہوا جو ملے تو سہا نہیں جاتا اور نہ ملے تو لگتا ہے سب کچھ چھن گیا ہے۔

دل میں صدا اٹھتی کہ محبوب کے گھر کے باہر کہیں گلیوں میں بیٹھا اس گھر کو دیکھتا رہوں جہاں یار کا بسیرا ہے۔ ان در و دیوار کو سلام کروں جو آس پاس رہتی ہیں۔ ان راستوں کی مٹی چوموں جہاں محبوب نے قدم رکھے ہیں۔ ہجر کی راتوں میں جب یاد سے گلا رندھ جاتا اور آنکھیں سمندر بن جاتیں تب مجھے شہزاد یاد آتا۔ فرق اتنا تھا کہ شہزاد کا محبوب عشق کے رمز سے انجان جب کہ میرا محبوب عشق کے رموز سے واقف تھا۔ انہوں نے دیوانے کی سکت کے مطابق دیوانگی بڑھائی۔ گلے لگنے کی خواہش بڑھی تو بانہیں پھیلا کر اندر میں طوفان کو پُرسکون کیا۔ آفتاب نے اتنی ہی روشنی دی جس سے پروانہ تپش محسوس کرے لیکن جلے نہیں اور نہ دیوانہ ہو کر گلیوں میں گھومتا پھرے۔ اب احساس ہوا کہ دل میں اٹھتے طوفان کو اگر قربت کی چند گھڑیاں میسر آ جائیں، محبت کے چند ایسے بول یا اتنی روشنی مل جائے جس سے پروانے کے جل مرنے کے شوق کی تسکین ہو سکے تو عشق — جنون سے بچ جاتا ہے۔

اکثر خیال آتا تھا کہ شہزاد کے ساتھ میرا رویہ مناسب نہیں تھا کیوں کہ محبوب تو سراپا شفقت ہوتا ہے۔ مجھے عشق کی آگ میں کوئلے کی طرح چٹخنے والے کو دو بول، بول کر دل جوئی کر کے، اس کے دامن کو، اس کے اپنے آنسوؤں سے تر کرنا تھا تا کہ بے چینی کو قرار ملتا۔ چوں کہ میں نے خود اس سے پہلے عشق کی تپش محسوس نہیں کی تھی، کسی اور کے درد کا درماں کیا کرتا! یہاں کون کسی کا ہو سکتا ہے، کون کسی کے لئے کچھ کر سکتا ہے — ہر ایک اپنی تلاش میں ہے۔ شہزاد کے من مندر میں تصویر اس کی اپنی تھی جو اس کو میری شکل میں نظر آتی تھی کیوں کہ میں نے مرشد کی باتوں سے اس کو اندر میں محبت کا راستہ اور خود سے واقف ہونے کی راہ دکھائی تھی۔

www.ksars.org

مرشد کریم فرماتے ہیں کہ کسی کو بنانے کے لئے خود کو کھونا پڑتا ہے۔جب تک تم اپنے آپ کو نہیں کھوؤ گے، دوسرا بندہ کچھ نہیں بنے گا۔ماں اپنا خون نچوڑ کر بچے کے اندر انڈیلتی ہے تو بچے کی نشوونما ہوتی ہے۔اب کوئی بھولا بھٹکا پروانہ آتا ہے تو میں علم کو چھوڑ کر عشق کو امام بنالیتا ہوں۔نہ عشق میرا ہے نہ علم میرا، مجھے تو بس محبوب کے مشن کو اپنا کر لوگوں کے لئے ایثار کرنا ہے، جیسے بھی ہو۔

یہ عشق اور جنون کا راستہ ہے۔میں نے جان لیا ہے کہ شمع روشنی دینے کے لئے جلتی ہے، خاکستر کرنے کے لئے نہیں جلتی ۔

محبوبیت یہ ہے کہ عاشق کو ایسے جلایا جائے کہ روشنی قائم رہے، نہ کہ وہ اندھیروں میں گم ہو جائے۔خاکستر کرنے سے بہتر ہے کہ سلگا دیا جائے جیسے محبوب کرتا ہے — وہ نہ جلا کر راکھ ہونے دیتا ہے اور نہ بجھنے دیتا ہے۔

www.ksars.org

عارفہ صبیح خان

اِقبالؔ اور فلسفہ ٔعشق

عشق کا جذبہ سود و زیاں نہیں دیکھتا۔ یہ عشق کا ہی زمزمہ اور سرمستی ہے جس نے انسانی شعور کو ارتقائی منازل سے گزارا ہے۔ عشق کی جولانی نے علامہ اقبالؔ کے کلام کو حیات جاوداں بخشی ہے۔

عشق کیا ہے۔۔؟ بے کلی ، بے قراری ، راحت و انبساط ، حاصل زندگی ، منزل مقصود یا دُکھ اور کرب کا اندھا صحرا۔۔؟؟؟ عشق سکون جان بھی ہے اور حرز جاں بھی!! عشق کا نشہ گہرا ہے خواہ وہ حقیقی ہو یا مجازی، عشق ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ عشق زمزمہ ٔحیات اور کائنات کا فسوں ہے اور انسان عشق کا اسیر ہے۔ عشق تو زمین کے ذروں سے آسمان کے تاروں تک پھیلا ہوا ہے۔ عشق کے دم سے ہی دنیا کی کشش باقی ہے۔

پھر بھی یہ عشق کیا ہے۔۔۔؟ یہ کیسے ہو جاتا ہے اور انسان کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ آخر عشق میں ایسی کونسی تاثیر ہے جو انسان میں ایک نئی روح پھونک دیتی ہے؟؟؟؟ اور عشق کا مقام کیا ہے؟؟؟ عشق کا رنگ گہرا کس طرح ہوتا ہے؟؟؟ ان سارے سوالوں کے جواب ہمیں اقبالؔ کی شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں۔ آج تک ''عشق'' کی جتنی بھی تعریفیں ہوئی ہیں ان میں سب سے جامع اور مستند تعریف اقبالؔ کی ہے۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ ٔ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

www.ksars.org

عشق کے ہیں معجزات، سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام، صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقین اور یقین فتحِ باب

ہمارے ہاں اقبالؔ کے فلسفۂ عشق پر بہت کم بحث ہوئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اقبالؔ کی خودی پر ہی تحقیق و تالیف ہوتی رہی جبکہ اقبالؔ نے خودی کے ساتھ عشق پر زور دیا ہے کیونکہ عشق کے بغیر انسان ادھورا ہے۔ عشق تو انسان میں خون کی طرح موجزن ہے خواہ وہ عشق حقیقی ہو یا مجازی۔ عشق کی عظمت اس کی گہرائی میں ہے۔

اقبالؔ کے ہاں عشق کا مفہوم نہایت وسیع اور گہرا ہے۔ اقبالؔ نے عشق کو برتری اور اولیت دی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں جا بجا علم اور عشق کا موازنہ، عشق کی بڑائی بیان کی ہے۔ اقبالؔ کا کہنا ہے کہ علم کا بھی اپنا ایک مقام ہے لیکن عشق کا پہلا درجہ ہے۔ عشق افضل ہے، عشق برتر ہے۔ عشق دل ہے، عمل دماغ ہے!! اقبالؔ نے عقل کو عشق سے کم درجہ دیا ہے ان کے خیال میں عشق کے بغیر عقل کی راہنمائی اور علم کا توسل ممکن نہیں۔ جوں جوں زمانہ ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے ۔۔۔ مادیت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔ مادہ پرست علم اور عقل کو اولیت دیتے ہیں اور عشق کو ثانوی ۔۔۔ جس کے نتیجے میں علم محدود، نامکمل اور خام رہتا ہے۔ دوسری جانب عشق کی عدم موجودگی نے موجودہ دنیا کو جذبوں کی جدت سے دور اور عاری کر دیا ہے۔ خود فریبی، نفسا نفسی اور بُعد انہی عوامل کی پیداوار ہیں۔ علامہ مرحوم نے عقل اور عشق میں امتیاز کیا ہے اور عشق پر زور دیا ہے۔ اقبالؔ سے قبل کسی شاعر نے تصور عشق و عقل پر اتنی عرق ریزی سے کام نہیں کیا اور نہ دونوں کے اس طرح درجات مقرر کئے۔ اقبالؔ نے عشق اور عقل کی انسانی زندگی میں اہمیت کو دوچند کیا ہے۔ عشق و عقل ہی انسانی زندگی کے راستوں کا تعین کرتے ہیں۔ انہی کے توسط سے زندگی کی راہیں کھلتی ہیں۔

اقبالؔ کہتا ہے کہ عقل لاجواب ہے مگر زمان و مکان کی حدود کی پابند ہے مگر عشق باکمال ہے جو زمان و مکان سے ماورا ہے۔ اسی لئے عقل کو صرف ''خدا جو'' اور عشق کو ''خدا نما'' قرار دیا ہے۔

www.ksars.org

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمین پر، گزر فلک پہ میرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
دل نے سن کر کہا، یہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ، کیا ہوں میں

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے!
اور باطن سے آشنا ہوں میں

اقبالؒ عشق کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں عقل گو انسان کی بہت سے مقامات پر رہنمائی اور پاسداری کرتی ہے لیکن عشق میں جو جذبہ ٔ حرارت تڑپ، جرأت اور رسائی پائی جاتی ہے۔۔۔ عقل اس سے دور ہے۔ عقل منزل تک پہنچنے کے لئے سوچتی اور تدبیریں کرتی ہے لیکن عشق سب مرحلوں سے بے چون وچرا گزر جاتا ہے۔۔ عشق کا جذبہ سود وزیاں نہیں دیکھتا۔ جو شے سوچ بچار اور فائدے نقصان پر آمادہ کرتی ہے وہ عقل ہے جو منفعت کو پیشِ نظر رکھتی ہے لیکن عشق صلے سے بھی بیگانہ ہوتا ہے۔ انسان عمل کے لئے قدم اُٹھاتا ہے تو عقل پاؤں پکڑ لیتی ہے مگر عشق آگ میں بھی پاؤں ڈال دیتا ہے۔ یہ عشق کا ہی زمزمہ اور سرمستی ہے جس نے انسانی جذبوں کی کہانی اور ارتقاء کی منزلیں سر کیں۔ عشق نے وہ کام کر دکھایا جو عقل نہ کر سکی۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

عقل اور عشق کے فرق کو اقبالؒ نے ایک جگہ اور یوں واضح کیا ہے۔

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل

www.ksars.org

عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

غالبؒ کے ہاں عشق کی جو کیفیت ہے وہی رنگ اقبالؒ کی شاعری میں اپنی تمام تر شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔۔۔فرق صرف اتنا ہے کہ اقبالؒ کی شاعری نے عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا سفر طے کیا ہے، زمان و مکان اور کسی بھی بندش سے ماورا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالبؒ کی اردو فارسی شاعری کا سرور دوسری زبان کے لوگ نہ لیتے۔ کسے خبر تھی کہ غالبؒ مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں نئی روح پھونک دے گا جس کی بدولت غالبؒ کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان پھر وجود میں آئے گا۔ غالبؒ اور اقبالؒ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں خصوصاً عشق میں۔۔۔

اقبالؒ کی شاعری میں عقل و دانش کا پرتو بھی ہے لیکن عشق کی جولانی نے دراصل اقبالؒ کے کلام کو حیات جاوداں بخش دی ہے۔ ان کے ابتدائی کلام سے ہی اس کا آغاز ہو گیا تھا۔ ''بانگ درا'' کا بیشتر کلام عشق و محبت کی چاشنی سے لبریز ہے۔ ابتدا میں اقبالؒ نے عشق مجازی سے کام لیا جو عموماً ہر شاعر یا ہر عاشق کے ہاں نظر آتا ہے کہ عشق حقیقی تک پہنچنے کے لئے عشق مجازی کے مرحلے بھی راستہ آسان کرتے ہیں۔ کیوں کہ جو شخص خدا کے بندے سے محبت نہیں کر سکتا۔۔۔ وہ خدا کی محبت کا اہل نہیں۔ عشق کا سفر انسان سے شروع ہوتا ہے اور خدا پر ختم ہوتا ہے!! عشق کا جذبہ عمیق ہو، سچا ہو تو چاہے وہ مجازی ہو یا حقیقی ہو۔۔۔ اپنا رنگ دکھاتا ہے اور منزل پاتا ہے، یہ عشق کی انتہا ہے!

مرد خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق کی تقویم میں، عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق کی طلب بڑھ جائے تو عشق بیکراں ہو جاتا ہے جیسے اقبالؒ نے اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں کرب کے لمحوں سے گزرتے ہوئے کہا تھا کہ:

www.ksars.org

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

اقبالؒ عقل و عشق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقل کا بھی ایک مقام ہے لیکن عقل عشق سے برتر نہیں۔ جب عشق کے معاملات میں عقل کی مداخلت ہونے لگے تو عقل کی پسپائی ہوتی ہے لیکن عشق خام ہو تو عقل حاوی آجاتی ہے اور عقل کے فیصلے صرف مادیت کی راہ دکھاتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک عقل کی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرأت کی کمی ہے۔ اگر عشق علم کی پشت پناہی اور رہبری نہ کرے تو علم یا عقل منزل مقصود سے دور رہے۔ یہ عشق ہی ہے جو سود و زیاں سے بے نیاز ہوتا ہے اور عشق کی حرارت سے بے خطر انسان آگ میں کود جاتا ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو آگ کو گلزار اور سمندر کو سبزہ زار بنادیتا ہے۔ جو انہونی کو ہونی کر دیتا ہے اور دکھ کو سکھ میں بدل دیتا ہے۔ عشق کبریائی اور غرور کے بتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ یہ عشق ہی ہے جس کی رسائی آسمانوں تک ہے۔ لیکن عقل اسباب و علل کی بھول بھلیوں میں الجھ کر اصلِ حقیقت سے دور رہتی ہے۔ عشق سے اشیا کا مکمل علم اور صحیح بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

اقبالؒ کہتے ہیں کہ عشق جوں جوں بڑھتا ہے وجدان اور معرفت میں اضافہ ہوتا ہے اور جب انسان وجدان کی منزلوں میں پہنچ جاتا ہے تو پھر سب کچھ اس کا ہو جاتا ہے۔

www.ksars.org

گل نسرین

فراق ـــــ وصال

وہ شام کو ساحل پر ٹہلنے کے بعد گیلی ریت پر بیٹھ کر گھروندے بناتا تھا۔ پانی کی لہر آتی اور دیواروں کو بہالے جاتی۔ نہ جانے پانی اور مٹی سے کیا محبت تھی کہ یہاں آکر وہ ان دونوں کے درمیان تعلق تلاش کرتا اور تلاش سمندر کی لہروں میں گم ہو جاتی۔

وہ سوچتا تھا کہ پانی جب تلوے چھوتا ہے تو ٹھنڈک پیروں سے ہوتی ہوئی سینے تک پہنچتی ہے جیسے مٹی سے بنے وجود کو اپنے اندر جذب کر رہی ہو یا مٹی کے ذرّات کو یکجا رکھنے والے پانی کو سمندر سے جوڑ رہی ہو۔ لہر سے مٹی کے گھروندے کی دیواریں بہہ جاتیں تو اسے خوشی ملتی تھی کیوں کہ پانی کی لہر پانی کو مٹی سے آزاد کر کے ساتھ لے جاتی۔ مگر خوشی کے ساتھ پانی کی پانی سے دوری مٹتے دیکھ کر اندر میں تشنگی بڑھ جاتی تھی۔ دراصل اس دوری کو وہ اپنے اندر مٹتے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مٹی پانی اور خشکی تری کا سنجوگ عجیب ہے۔ یہ ساتھ رہتے ہیں، ایک دوسرے میں ملتے ہیں لیکن اپنی اپنی شناخت قائم رکھتے ہیں، نہ جانے انہیں فراق کیوں پسند ہے !

کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ بھائی ! جانتے ہو انجانے میں کیسا کھیل کھیل رہے ہو؟ لہروں کے بھنور میں پھنس گئے تو نکلنا ممکن نہیں۔

سر اٹھائے بغیر جواب دیا، پانی اور مٹی ایک دوسرے سے آزاد ہو کر اپنی اپنی مقداروں میں ملنا چاہتے ہیں۔ ساحل وصل اور فراق کا میدان ہے کوئی کھیل نہیں۔

نووارد بولا، تم دیکھتے نہیں کہ پانی ـــــ پانی سے مل رہا ہے پھر کیسا فراق ـــــ؟

www.ksars.org

نوجوان نے کہا، پانی ابھی پانی سے کہاں ملا۔۔۔؟

اگر مل گیا تو ساحل پر کیوں آتا ہے۔۔۔؟

اس میں اٹھنے والا مد و جزر کیا ہے۔۔۔؟

نہیں معلوم سمندر خود کو پانی دیکھتا ہے

یا پانی خود کو سمندر دیکھتا ہے !

شاید پانی کو معلوم نہیں کہ سمندر کیا ہے

یا سمندر پانی سے نا آشنا ہے!

کبھی اسے باہر پھینکتا ہے اور جب پانی دور ہوتا ہے تو اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اگر سمندر میں پانی وصل سے واقف ہے پھر فراق کیا ہے اور فراق ہے کیوں۔۔۔؟

نووارد نے آتی جاتی لہروں میں گھروندے بنانے میں مشغول نوجوان کو کچھ دیر خاموشی سے دیکھنے کے بعد جواب دیا، ممکن ہے کہ پانی آگہی کے مراحل سے گزر رہا ہے اور ساحل پر آ کر احساس ہوتا ہے کہ میں ہی سمندر ہوں اس لئے لوٹ جاتا ہے۔ نوجوان نے بے ساختہ سر اٹھا کر نووارد کو دیکھا اور کہا، اور تم کہتے ہو کہ میں بھنور میں پھنس جاؤں گا۔

وہ خاموش رہا۔

یاد رکھو! بھنور میں وہ شے پھنستی ہے جس کی سمت باقی لہروں سے جدا ہو۔ جس کو تم بھنور کہتے ہو، کبھی غور کیا ہے کہ وہ ہے کیا؟

لہجے پر زور دیتے ہوئے کہا، دائرہ ہے !

www.ksars.org

دائرے میں جو لہر ایک بار آجائے، وہ اسے اپنے محور سے نکلنے نہیں دیتا، دائرہ در دائرہ فاصلوں کو طے کرتا ہوا اندر میں لے جاتا ہے اور خود سے متعارف کرا دیتا ہے۔

میں تمہیں لہروں سے خبردار کرنے آیا تھا مگر خود اس قصے میں گم ہو گیا۔ بھائی خود بھنور بھی تو حرکت میں ہے۔ پھر وصال کیا ہے اور فراق کیا ہے——؟

نوجوان نے ریت کی دیواروں میں پڑنے والی دراڑ کو درست کرتے ہوئے کہا، فراق بھی وصال ہے۔ پانی میں رہ کر کوئی کیسے بتائے کہ پانی کیا ہے ؟ پانی سے الگ ہو کر ہی وہ پانی کو دیکھتا ہے۔ پھر احساس ہوتا ہے کہ کیا پانی کو پانی سے الگ ہو کر دیکھنا ممکن ہے ؟ اور وہ ایک بار پھر خود کو پانی کے سپرد کر دیتا ہے۔ نوجوان نے بتایا، میں برسوں سے سمندر کی کہانی دیکھ رہا ہوں، سن رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں۔ کیا تم نے لہروں میں تلاطم دیکھا ہے——؟

نووارد نے سر ہلایا کہ دیکھا ہے۔

نوجوان نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا، تم نے نہیں دیکھا۔ اب میری نظر سے سمندر کو دیکھو !

نووارد کی پشت سمندر کی جانب تھی، سر موڑ کر آبی ذخیرے پر نگاہ کی تو نظر آیا کہ لہریں اٹھتی بیٹھتی اور لپٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں۔

کیا نظر آیا——؟

بے قراری ہے !

نوجوان نے تشنگی کو زبان پر لاتے ہوئے کہا، یہ لہریں سمندر میں رہ کر فراق سے دوچار ہیں ! نووارد بولا، میرا ذہن اس بات کو قبول نہیں کرتا۔ پانی اگر پانی میں رہ کر بے چین ہو تو وصل کیسے اور کہاں ملے——؟ اگر یہی وجہ ہے تو ان لہروں کو وصل نہیں مل سکتا۔ مگر ایک بات غور طلب ہے۔

www.ksars.org

نوجوان نے پوچھا، وہ کیا؟

اگر پانی کا وصل سمندر سے ہے تو پھر پانی اوپر کیوں اٹھتا ہے۔ نووارد نے دور اٹھنے والی اونچی لہروں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسے تو اٹھنے کے بجائے بیٹھ کر نیچے تہ سے رجوع کرنا چاہئے۔

نوجوان کے چہرے پر گہری مسکراہٹ در آئی۔

کچھ دیر گزر گئی لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔

نووارد بھی نوجوان کے ساتھ ریت پر گھر بنانے میں مشغول ہو گیا۔ سمندری ریت کی مخصوص مہک اندر سرایت کی تو کچھ دیر بعد مہک کا احساس ختم ہو گیا۔ یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہاتھ گیلے اور ریت سے لت پت ہیں۔ ریت میں جذب پانی سے نووارد کے ہاتھ گیلے ہوئے، چمک ہاتھوں پر لگی، پانی جذب ہو گیا اور چمک ہاتھوں پر چپک گئی۔ نگاہ چمک پر مرکوز کی — روزن کھلا اور اس روزن میں فضا کا عکس نمایاں ہوا، پھر بادل نظر آئے اور بادل سے اوپر آسمان تھا۔

نووارد نے ڈوبتی ابھرتی سوچوں سے گھبرا کر اچانک نوجوان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور خبر دیتے ہوئے کہا، زمین پر سمندر آسمان میں بادل ہے۔

اور ان بادلوں میں پانی ہے۔ آسمان سے توانائی بادلوں میں داخل ہوتی ہے تو بارش برستی ہے۔ لہریں اس لئے اوپر اٹھتی ہیں کہ ان کا سورس سمندر کا آبی سانچہ یا تہ نہیں، آسمان سے برسنے والا پانی ہے ! نوجوان نے بات مکمل کی۔

نووارد کو کچھ دیر پہلے اپنے سوال پر اس کی خاموشی اور گہری مسکراہٹ کی وجہ معلوم ہو گئی تھی۔

نوجوان جانتا تھا کہ یہ شخص روز اسے یہاں آتے دیکھتا ہے اور اس کے معمول سے واقف ہے۔ اسے علم تھا کہ میری طرح یہ بھی فراق میں مبتلا ہے اس لئے اپنے اندر کی تشنگی میرے اندر دیکھ کر آج یہ قریب آیا اور مجھے ان لہروں سے خبردار کیا۔ ورنہ روزانہ کتنے لوگ یہاں سے گزرتے ہیں، کبھی کسی نے رک کر نہیں پوچھا کہ بار بار گھر کیوں بناتے ہو۔ اس نے کہا،

www.ksars.org

آسمان، بادل، پانی، سمندر اور ساحل

ساحل، سمندر، پانی، بادل اور آسمان

سب فراق کا نظام اور وصال کے سلسلے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے الگ لیکن ملے ہوئے ہیں۔ پانی کبھی ساحل پر جاتا ہے، کبھی نیچے بیٹھتا ہے اور کبھی اوپر اٹھتا ہے——بے قراری بتاتی ہے کہ پانی سفر میں ہے۔

نووارد ہنستے ہوئے بولا، میں تمہیں خبردار کرنے بیٹھا تھا اور تمہارے پاس بیٹھ کر خود خبر بن گیا۔ ان لہروں اور گیلی ریت میں تسکین کیسی ہے؟

نوجوان نے متوجہ کیا، ریت میں چمک بھی تو ہے۔

ہاں! اس چمک میں ایک در کھلا اور میں نے آفاق کو انفس میں دیکھا۔ اسی چمک میں مجنوں لیلیٰ کو دیکھتا تھا۔ وہ بھی تمہاری طرح سمندر کے کنارے بیٹھا ریت چھان رہا تھا۔ میری طرح کسی نے اس سے پوچھا،

میاں مجنوں! ریت کیوں چھان رہے ہو——؟

مجنوں نے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور جواب دیئے بغیر ریت چھاننے میں مصروف ہو گیا۔ وہ بندہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور پوچھا، مجنوں بھائی یہ کام کب سے کر رہے ہو——؟

مجنوں بولا، پتہ نہیں۔

ریت کیوں چھان رہے ہو——؟

اس بار مجنوں نے نہایت اشتیاق سے کہا، لیلیٰ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ اسے تعجب ہوا کہ لیلیٰ! کیا لیلیٰ ریت میں رہتی ہے——؟

مجنوں کی نگاہیں یک لخت ریت کے ذرّات میں گم ہو گئیں۔ آنکھ کے ڈیلے ٹھہر گئے اور اس نے کہا، اگر ریت میں لیلیٰ نہیں ہے تو پھر ریت میں چمک دمک کیسی؟ یہ لیلیٰ کے حسن کا جمال ہی تو ہے جس سے ریت میں ذرّات چمک رہے ہیں۔

www.ksars.org

کہانی سن کر نوجوان نے کہا، زمین بے قرار ہے اور گردش میں ہے کہ اس کا مرکز آسمان ہے۔ آسمان بے قرار ہے، ایسا بے قرار کہ تکمیل کی تلاش میں نفی کر کے اپنی سمتیں گم کر دی ہیں۔ آسمان کا دوسرا رخ زمین ہے۔ پانی، مٹی، آسمان، زمین اور جو کچھ ان میں ہے، یہ سب ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کے ملن اور دوری سے کائنات کا نظام قائم ہے۔

نووارد بولا، لگتا ہے تم قریب آ گئے ہو؟

نوجوان نے بے نیازی سے کہا، دور میں پہلے بھی نہیں تھا۔ بس ناواقف تھا اور ناواقفیت دوری بن گئی۔ جو پانی سمندر ہے، کیا یہاں بیٹھ کر میرے ہاتھوں میں جذب نہیں ہو گیا——؟ ریت میں چمک آئینہ ہے اور میں اس آئینے میں کیا کیا نہیں دیکھتا۔ ریت میں ٹھنڈک جسم کا حصہ محسوس ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ کمہار نے اسی مٹی سے مجھے بنایا ہے، ایک روز اسی میں مل جاؤں گا، لہر آئے گی اور مجھے سمندر سے آشنا کرے گی اور سمندر بخارات بن کر بادلوں تک پہنچا دے گا۔ پانی کی طرح میں بھی سفر میں ہوں !

وقت کے ابدال کا کہنا ہے،

دنیائے طلسمات ہے ساری دنیا
کیا کہئے کہ ہے کیا یہ ہماری دنیا
مٹی کا کھلونا ہے ہماری تخلیق
مٹی کا کھلونا ہے یہ ساری دنیا

گھروندا مکمل ہوا تو ایک بڑی لہر آئی اور ریت کے ذرّات بہا لے گئی۔ جو باقی رہ گئے وہ ایک بار پھر قالب میں ڈھلنے کے لئے کمہار کے منتظر تھے۔

وہ دونوں کچھ کہے بغیر اٹھے اور کل پھر ملنے کے لئے متضاد سمتوں میں چل دیئے۔

www.ksars.org

سعیدہ خاتون عظیمی

عشق اور حضوری

ہر ذی شعور اس بات سے واقف ہے یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہمیشہ سے موجود تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے کن کہہ کر صفتِ علیم کے مظہر علم کائنات کی تجلیوں کو حرکت میں آنے کا حکم دیا تو کائنات ظہور میں آگئی، علم کائنات کی وہ تجلیاں جو حکم کن سے حرکت میں آکر کائنات کے ظہور کا باعث بنیں اور کائنات کی بساط اول کی حیثیت سے مظہر کائنات کے باطن میں مخفی ہو گئیں۔ بندہ کائنات یا مخلوق یا مظہر ہے۔ کائنات یا مخلوق یا مظہر اسمائے الٰہیہ کے ظاہری خدوخال یا شکلیں ہیں۔ بندہ یا مخلوق جب خالق کو جاننے یا پہچاننے کی جستجو کرتا ہے تو اسے مظہر سے علم کائنات کی جانب لوٹنا پڑتا ہے۔ اور علم کائنات سے گزر کر وہ دوبارہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علیم میں جذب ہو جاتا ہے جہاں کن کہنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفتِ علیم میں علم کائنات کے اندر اس کا وجود قائم تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں احسن الخالقین ہوں۔ علم الٰہی کے اندر کائنات اللہ تعالیٰ کے تفکر کا ایک خاکہ ہے۔ ان خاکوں میں اسمائے الٰہیہ کی روشنیاں جب رنگ بھرتی ہیں تو انسان کی نظر رنگوں کو دیکھتی ہے۔ اور روشنیاں ان رنگوں کے پردوں میں چھپ جاتی ہیں۔ جمال الٰہی کی روشنیاں مشیت ایزدی کے اسرار بن کر مخلوق کی رگِ جان میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ جب بندہ اپنے باطن میں نظر ڈالتا ہے تو جمالِ الٰہی کی صورت میں کائنات کا ہر رنگ اپنے باطن میں دیکھ لیتا ہے۔ باطن کی ہر روشنی اس کی خالقیت اور ربوبیت کی تجلی ہے۔ خالقیت کا عکس ذات ہے اور ربوبیت کا عکس صفات ہے۔ علم کائنات کا ہر نقطہ ذات کی ایک تجلی ہے۔ ذات کی یہ تجلی اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کا ایک عکس ہے۔ تجلی کی روشنی روح کے نقطے پر جمع ہو کر روح کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ روح صفتِ خالقیت کا وہ عکسِ تخلیق ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو احسن الخالقین کہا ہے۔ روح ربوبیت کی روشنی میں نشوونما پاتی ہے۔ ربوبیت کی تجلیاں روشنی کے ایسے دائرے ہیں جو ہر دم روح

www.ksars.org

کو گھیرے ہوئے ہیں۔ روح کی حرکت روشنیوں کے ان دائروں کے اندر عمل میں آتی ہے اور یہی روشنیاں روح کی توانائی ہیں۔ ذات کی تجلی کا نقطہ روح کی اصل ہے اور روح اپنی حیات کے لئے اپنی اصل کے ساتھ وابستہ رہنے پر مجبور ہے۔ تجلی ذات کے نقطے پر صفتِ خالقیت کا عکس روح کی نظر سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس عکس کو روح کی آنکھ نور کے ان دائروں کے ذریعے دیکھتی ہے جو دائرے روح کو گھیرے ہوئے ہیں۔ نور کے یہ دائرے خالقیت کا جمال ہیں۔ جس کے اندر خالق کی وہ مشیّتیں کام کر رہی ہیں جو ایک قدم نیچے اتر کر روح کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔

بندہ جب اپنے آپ کو اللہ تعالی کے احسانات اور لطف و کرم اور اس کی نعمتوں کا شکر گزار بنالیتا ہے تو اس پر اللہ تعالی کی صفتِ خالقیت اور صفتِ ربوبیت کی تجلیوں کا نزول ہونے لگتا ہے۔ یہ روشنیاں ان دائروں کے اندر منتقل ہوتی چلی جاتی ہیں جو دائرے روح کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ صفتِ خالقیت کی روشنی سے روح کو ذاتِ باری تعالی کا تفکر عطا ہوتا ہے۔ جب کہ صفت ربوبیت کی تجلیوں سے کائناتی شعور پیدا ہوتا ہے یا اپنی ذات کا شعور ہوتا ہے۔ جیسے جیسے روشنیوں کے دائروں میں ذات کی تجلیاں جذب ہوتی جاتی ہیں روح پر انوار الٰہیہ کا دباؤ ہوتا جاتا ہے۔ اسمِ ذات یا اسم اللہ کی روشنیوں کا دباؤ روح کے اندر اللہ تعالی کے عشق کی بنیاد ڈالتا ہے پھر جیسے جیسے بندہ اللہ تعالی کی مہربانیوں میں شکر اور اس کی عنایتوں میں تفکر کرتا جاتا ہے۔ تجلی ذات کے نقطے سے انوار الٰہیہ نکل کر دائروں کے اندر پیوست ہوتے رہتے ہیں اور بندے کے دل میں عشق الٰہی جڑ پکڑنے لگتا ہے اور اس کا رابطہ نسبتِ عشق کے ذریعے اللہ تعالی کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔

روشنیوں کے دائرے کی فضا AURA کہلاتی ہے۔ تجلی کی روشنی جب نیچے اترتی ہے تو اس روشنی میں خالق کا تفکر کام کرتا ہے جو صفت تخلیق ہے۔ تجلی کی روشنی اور اکی فضا تخلیق کرتی ہے جو روشنیوں کے رنگین دائرے ہیں۔ تجلی کے ہر نقطے پر ذات کا ایک عکس ہوتا ہے جو اللہ تعالی کے تفکر کا ایک خاکہ ہے۔ بندہ جیسے جیسے اللہ تعالی کے عشق میں ڈوبتا جاتا ہے تجلی کے اس خاکے یا ذات کے انوار اس پر محیط ہو جاتے ہیں۔ تجلی کے انوار کا ہر دائرہ ذات کی صفات ہیں۔ روح ان روشنیوں کو جذب کرتی جاتی ہے اور بندے کے اندر ان کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ کائنات کا ہر قدم اپنے ارتقاء کی جانب رواں دواں ہے۔ کائنات کی ہر شے ایک خاکہ یا خلاء ہے۔ یہی خلا انسان کا شعور ہے۔ ان خلاؤں میں اور اکی روشنیاں آتی جاتی رہتی ہیں جن کے ذریعے شعوری حواس پیدا ہوتے ہیں۔ یہ حواس روشنی کے علوم ہیں جو کائنات کے تخلیقی فارمولوں کے علوم ہیں

www.ksars.org

۔ تجلی ذات کا ہر نقطہ خالقیت کا وصف ہے۔ خالقیت کے وصف کی تخلیق روح ہے۔ روح کے اندر اللہ تعالیٰ کی تخلیقی صفات کام کر رہی ہیں۔ روح ان صفات سے کام لے کر اپنا شعوری جسم تخلیق کرتی ہے۔ شعوری جسم روح کے تفکر کا ایک خاکہ ہے اس خاکے میں روح اورا (AURA) کی روشنیوں کو ذخیرہ کرتی ہے۔ یہ روشنیاں وہ فارمولے ہیں جو تجلی ذات کے نقطے سے روح کے اندر منتقل ہوئے ہیں۔ روح شعور کے خلا میں یا خاکے میں آہستہ آہستہ خود اپنی ذات کے فارمولے کی روشنیاں منتقل کرتی رہتی ہے۔ کائنات کی روح کا ہر فارمولا ذات کا ایک تفکر ہے۔ شعور میں جیسے جیسے فارمولے کی روشنیاں منتقل ہوتی جاتی ہیں ذات کا تفکر بھی شعور کے اندر منتقل ہو جاتا ہے۔ اور جب تخلیقی فارمولے کی تمام روشنیاں جو تجلی سے روح کے اندر منتقل ہوئی تھیں روح کے ذریعے شعور میں منتقل ہو جاتی ہیں تو تفکر کا خاکہ مکمل ہو جاتا ہے۔ شعور کا یہی جسم انسان کا مادی جسم ہے جس کا دوسرا رخ تخلیقی فارمولوں کی روشنی ہے۔ مادی جسم جب دنیا میں ختم ہو جاتا ہے تو روشنیوں کا جسم ان حواس کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ جو حواس اس کے اپنے اندر کی روشنیوں میں موجود ہیں۔ ان حواس کے ساتھ وہ روشنیوں کی فضا میں سفر کرتا ہے۔ عشق الٰہی کی روشنیاں شعور کے اندر نور اور تجلی کے حواس پیدا کرتی ہیں۔ بندے کے اندر جیسے جیسے اللہ کا عشق مستحکم ہوتا جاتا ہے وہ اپنی ذات کے تجلی کے نقطے سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا ہر قدم ارتقاء کی منزل کی جانب اٹھتا ہے۔ جب بندے کے اندر تجلی کا شعور پیدا ہو جاتا ہے تو تجلی کا نقطہ اس کے لئے ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس کے اندر قلب کی نظر صفتِ خالقیت کے عکس کو دیکھتی ہے۔ خالقیت کا ہر عکس اپنی ذات میں ایک کائنات ہے۔ پس بندہ عکسِ خالق کے ساتھ اپنی ذات کو اس کائنات میں چلتا پھرتا دیکھتا ہے۔ جوں جوں اللہ تعالیٰ کا عشق اس کے اندر سرایت کرتا جاتا ہے اسی مناسبت سے وہ اپنی کائنات میں اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بندہ ذات کی روشنیوں کے اندر مکمل طور پر آجاتا ہے اور وہ محسوس کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر طرف سے اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

ذات کی تجلی کو بندہ اس حد تک محسوس کرتا ہے کہ سانس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اسے اپنے باطن میں داخل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کا ہر رواں عشق کی ایک داستان بن جاتا ہے جس کے اندر وہ اپنے محبوب کے نت نئے جلوے دیکھتا رہتا ہے۔ انسان کی یہی حالت حضوری کہلاتی ہے۔ تجلی ذات کی فضا اللہ تعالیٰ کی صفت علیم کی تجلیاں ہیں جس کے اندر علمِ

www.ksars.org

کائنات ہے۔ عشقِ الٰہی کی کشش بندے کو اس کی کنہ کی طرف کھینچتی ہے جہاں وہ تجلیوں کے عالمین میں کائنات کی وہ تصویر دیکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے تفکر اور ارادے کی تخلیق ہے۔ سانس کے ذریعے اللہ کا تفکر اس کے اندر داخل ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ کی نظر سے کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور براہ راست اللہ تعالیٰ کے ذریعے ان کے علوم حاصل کرتا ہے۔ اللہ کا عشق اس کے رگ و ریشے میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے کہ اس کی ہر حرکت اور ہر فعل اللہ کا امر بن جاتا ہے، اس کی زندگی کا ہر قانون اللہ کا ارادہ اور اس کے امر کی حقیقت بن جاتا ہے۔ تب بندہ تجلی کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کے کلام کو سنتا ہے اور تجلی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے۔ اور تجلی کے حواس کے ذریعے اللہ کو پہچانتا ہے اور کائنات کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے۔

تجلی اللہ تعالیٰ کی ذات کا عکس ہے۔ سالک نسبتِ عشق کی منزلیں طے کرتا ہوا تجلی کے عالمین میں پہنچ جاتا ہے اور عالمین کی ہر شے سے اسے اللہ تعالیٰ کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔ سالک پر روح کا یہ شعور جب غالب آجاتا ہے تو اسے حضوری حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر صفات یا روح کے حواس پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے شعور کی سطح روحِ حیوانی سے بلند ہو کر روح اعظم کی حدوں میں پہنچ جاتی ہے اور اس کے حواس اسفل سے گزر کر اعلیٰ علیین کی حدود میں کام کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں بندے کے اندر حیوانی تقاضے مغلوب ہو جاتے ہیں اور انسانی تقاضے غالب آجاتے ہیں (بندہ اپنی توانائی براہ راست نور سے حاصل کرتا ہے جس کی وجہ سے مادیت کا احساس اس کے اوپر سے ہٹتا چلا جاتا ہے) وہ کائنات کی ہر شے کو اس کے نوری فارم میں دیکھنے لگتا ہے اور اس کا ادراک ہر شے سے نوری حواس کے ذریعے متعارف ہوتا ہے۔

ہر مادی جسم کا دوسرا رخ روشنیوں کا جسم ہے۔ جب مادی حواس مغلوب ہو جائیں تو روشنیوں کے حواس غالب آجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں بندے کے تقاضے ایک عام انسان سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ یہاں مختلف ہونے سے مراد تقاضوں کا یکسر تبدیل ہونا نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان ایک مخصوص تقاضوں کا یکجائی نام ہے۔ اگر یہ تقاضے انسان کے اندر سے نکال دیئے جائیں تو اس کی فطرت یا فارمولا ہی بدل جائے گا اور وہ انسان نہیں رہے گا۔ روشنیوں کے حواس یا نور کے حواس بندے کے اندر اسفل کی بجائے اعلیٰ احساسات کو متحرک کرتے ہیں۔ مثلاً ایک عام آدمی کو کم از کم چھ سات گھنٹے روزانہ سونا ضروری ہے ورنہ اس کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ مگر بحالت حضوری بندے کے حواس اتنے طاقتور ہو جاتے ہیں کہ نیند

www.ksars.org

اور اس کی ضروریات پر اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حضوری میں اس درجہ جذب ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر سوائے قربِ الٰہی کے اور کوئی تقاضا پیدا نہیں ہوتا۔ اولیاء اللہ کے واقعات میں اکثر ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

آج سے سات آٹھ سو سال پہلے حضرت مخدوم پاک علی احمد صابر کلیری گزرے ہیں جو حضرت بابا فرید گنج شکر پاک پٹن شریف کے مرید خاص تھے۔ آپ کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ آپ طویل عرصے تک کلیر شریف میں جہاں آپ کا مزار شریف ہے ایک گولر کے درخت کے نیچے استغراق کی حالت میں کھڑے رہے تھے۔

حضوری ایسی حالت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا حکم بندے کے لئے قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضوری میں مصلحتوں کے اسرار سامنے آجاتے ہیں جس کی وجہ سے ہر حکم بندے کے لئے قانون کا درجہ رکھتا ہے جس میں بندے کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بندے کا ہر کام اللہ تعالیٰ کے امر یا حکم کی حرکت یا ارادے کی حرکت بن جاتا ہے۔ افعال کی یہ حرکت خواص کے دائرے میں عمل میں آتی ہے اور عوام الناس اس کی حکمتوں سے بے خبر یا لاعلم رہتے ہیں۔ اور اس وقت تک لاعلم رہتے ہیں جب تک کہ ان کے خواص اعلیٰ علیین کی سطحوں پر نہیں پہنچ جاتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اسرار کی حکمتیں اور مشیتِ ایزدی کی مصلحتیں عوام الناس کی فہم سے بالاتر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کائنات کے داخلی امور کی حقیقتوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ اور جب حقیقت کے دائرے کی کوئی شے ان کی نظر میں آتی ہے تو وہ اس کا مفہوم اپنے شعور کے دائرے میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ نے کئی ایسے قوانین بیان فرمائے ہیں جو آپ ؐ کی بارگاہِ الٰہی میں حضوری اور محبوبیت پر دلالت ہے۔ مثلاً آپ ؐ کا چار سے زیادہ شادیاں عوام الناس کے شعوری دائرے سے الگ ہے۔ کوئی بھی بندہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو اپنے قیاس سے ہرگز بھی نہیں سمجھ سکتا۔ جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے پردے میں اس کی مصلحتوں کا ریکارڈ اس کے سامنے نہ آجائے۔ پس راہِ عشق میں حضوری محبوبیت کا درجہ ہے اور محبوب کے لئے ہر قانون عشق کے دائرے میں ہے اور عشق لامحدود ہے۔ بندہ جب اللہ کو اپنا محبوب بنالیتا ہے تو بندے کا ہر تقاضا اللہ کا ارادہ بن جاتا ہے۔ اور اللہ اپنے ارادے اپنی قدرت میں قادر مطلق ہے۔ مطلقیت کی یہ ڈور جب بندے کے اندر حرکت کرتی ہے تو اس کا ہر فعل مشیتِ ایزدی کے تابع ہوتا ہے اور مشیتِ ایزدی اللہ پاک کا ارادہ ہے۔

www.ksars.org

عابد محمود

قاصد — مکتبِ عشق

کائنات کی بنیاد محبت ہے اور محبت کی عملی شکل ایثار ہے۔ سورج، چاند، ستارے، زمین، بادلوں کو چلانے والی خراماں خراماں ہوائیں، پھلوں سے جھکے درخت، ماں کی مامتا، باپ کی شفقت اور وسائل — سب محبت کے قاصد ہیں۔

مکتبِ عشق کا سبق، دردِ دل سے شروع ہو کر ذات کی نفی پر ختم ہوتا ہے۔ جب ذات بے ثبات ہوتی ہے تو صرف محبوب باقی رہ جاتا ہے۔ ذات کی نفی تک عشق جس سولی پر لٹکاتا ہے، ہر میخ سے لہو رِستا ہے۔ سولی پر لٹکنے والا درد سے کراہتا ہے لیکن عشق سے دست بردار نہیں ہوتا۔

ایہ ایسی کھیڈ پیاراں دی
ایہ ایسا بحر محبت دا
کسے کیتا ایویں پار وی نئیں
کوئی منیا اپنی ہار وی نئیں

ترجمہ: محبت کے کھیل میں عاشق بحرِ بے کنار (سمندر جس کا کوئی کنارہ نہیں) میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ ساحل نظر نہیں آتا لیکن وہ ہار نہیں مانتا اور نہ عشق سے دست بردار ہوتا ہے۔

ہم محبوب کے در پر اپنی محبت کے ثبات کے لئے حاضر ہوتے ہیں لیکن عالمِ حیرت ہے کہ ہمیں علم نہیں ہوتا کہ اپنی محبت کے پردے میں ہم کس کا قاصد بن کر آتے ہیں۔

میرے ساتھ ایسا کیوں؟

www.ksars.org

قرۃ العین نے سسکتے ہوئے شکوہ کیا۔

میں نے کہا، اللہ کا نظام ہے۔ ہر کوئی اپنے حصے کی ڈیوٹی دینے دنیا میں آیا ہے۔

مجھے اطمینان سے جواب دیتا دیکھ کر اس نے طنز کرتے ہوئے کہا، یہ عورتوں کے مسائل ہیں جن کو مرد نہیں سمجھتے۔ شادی کے بعد مرد اپنے عزیز و اقارب سے ملتے ہیں لیکن عورتوں کو پابند کر دیتے ہیں کہ اِس سے ملنا اور اُس سے نہیں ملنا۔ جب سے شادی ہوئی ہے، مرشد کے در پر جانا ممکن نہیں رہا۔ کیا مرشد ماں نہیں ہوتی؟ کیا مرشد باپ کی جگہ نہیں ہوتا؟ بھلا ماں باپ سے ملنے سے بھی کوئی روکتا ہے؟

اس کے سوال تیر کی طرح دل پر لگے۔

میں اس کی عقیدت سے واقف تھا۔ اس کو اللہ کی مخلوق کی خدمت کے لئے جو ڈیوٹی سونپی جاتی تھی، وہ دیوانوں کی طرح اسے پورا کرتی۔ اسے مرشد کے مشن کا حصہ بن کر قلبی سکون ملتا تھا۔ چہرہ آسودگی کی تصویر تھا، وہ منتظر رہتی تھی کہ اگلی ڈیوٹی کب ملے گی۔

بھئی، مرشد چاہتے ہیں کہ تم سماج کی خدمت کرو۔ اب شادی ہوگئی ہے، ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں، بچے ہیں، ان کی اچھی تربیت کرو، ان کو اللہ اور خاتم النبیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا بناؤ۔ مرشد کی طرف سے اب تمہاری ڈیوٹی ہے کہ بچوں میں پیغمبران کرام علیہم السلام کی طرز فکر منتقل کرو، یہ نسلوں کی تربیت ہوگی۔

وہ مسکرادی، مسکراہٹ میں درد تھا۔

اس نے کہا، میں یہی کرتی ہوں کہ چراغ کی روشنی جو مرشد سے ہمیں ملی ہے، اپنے بچوں کے دل ان سے روشن کروں لیکن جس استاد نے باپ بن کر مجھے اللہ رسولؐ سے محبت کرنی سکھائی اسے دیکھنے کی خواہش نہ رکھوں؟

میں نے کہا، جانتی ہو جب ہم روحانی سلسلے میں داخل ہوئے تو پہلا سبق کیا ملا تھا؟

www.ksars.org

"مادی جسم اصل نہیں، روح اصل ہے اور روح مکانیت کی پابند نہیں۔"

ہم مرشد کے بچے ہیں۔ ہمارے تار ان سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کو یاد کرتے ہیں تو تار ملتے ہیں اور کیا خبر کہ کس نے کس کو یاد کیا ہے!

یہ سننا تھا کہ وہ تڑپ اٹھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا کہ دل کا بوجھ آنسوؤں کے ذریعے باہر آجاتا ہے۔

وہ چپ ہوئی تو میں نے کہا، ان کے پیغام کو حرزِ جاں بنالو، لوگوں کا دل نرم ہو جائے گا۔ اس نے کہا، غم باتوں سے دور نہیں ہوتا۔

وہ زندگی میں ایک دفعہ مرشد سے ملی تھی۔ جب دوسری ملاقات کا وقت آیا تو باری آنے سے پہلے ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ سویرے روانگی تھی، دیکھنے کی حسرت رہ گئی۔ وہ آج بھی روتے ہوئے کہتی ہے کہ مجھے اس قابل نہیں سمجھا گیا۔ سب کی ملاقات ہو گئی اور میں قطار میں اس جگہ کھڑی رہ گئی جس کا نمبر آنا لکھا نہیں تھا۔

میں نے بلا سوچے سمجھے کہا، میرے ساتھ چلو، دونوں بہن بھائی سلام کر کے آجائیں گے۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی دیکھ کر غلطی کا احساس ہوا۔ وہ سسرال کی وجہ سے شہر میں مرضی سے آجا نہیں سکتی تھی اور میں دوسرے شہر لے جانے کی بات کر رہا تھا۔

کسی شاعر نے کہا ہے،

مرا حال پوچھ کے ہم نشیں
مرے سوزِ دل کو ہوا نہ دے
بس یہی دعا میں کروں ہوں اب
کہ یہ غم کسی کو خدا نہ دے

www.ksars.org

وہ خیال میں کھوئی گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھی رہی۔ اتنے میں بیگم چائے لے کر آئیں، وہ اس کے حال سے واقف تھیں۔ اسے چائے دے کر سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور چلی گئیں۔ طویل خاموشی کے بعد قرۃ العین نے مجھ سے پوچھا، اگر آپ کی اپنے ماں باپ سے ملاقات روک دی جائے تو آپ کا کیا حال ہو گا؟

میں اس کے سوال پر لرز گیا لیکن ہمت دینا مقصود تھا اس لئے لہجہ مضبوط رکھتے ہوئے کہا، مرشد کی یاد قلبی سکون ہے۔ صرف تم نہیں، میں بھی جسمانی طور پر میلوں دور رہتا ہوں۔ جب یاد ستاتی ہے اور ڈگمگانے لگتا ہوں تو تصور کی چادر اوڑھ لیتا ہوں۔

ہاں ! آپ کی ملاقات ہو جاتی ہے نا۔ یہ خالی پیٹ کا درد ہے، آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اس نے تکلیف دہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا پھر بولی، ہزار وسوسے دل کو بے چین رکھتے ہیں۔ اب تو لگتا ہے جیسے مجھے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہمارے دلوں میں محبت کی چنگاری کیوں روشن ہوتی ہے — ؟ ہم پروانے کیوں بن جاتے ہیں — ؟

یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

بیٹھے بیٹھے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ کیا کہوں کہ کیوں رو رہی ہوں؟ بے بسی سے قالین کے نرم گوشوں کو ناخنوں سے کریدتے ہوئے بولی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا، قالین پر کیوں ظلم کرتی ہو؟ یہ بھی درد میں مبتلا ہے۔ اس کے تار اپنے خاندان سے فراق میں قالین بنے ہیں۔

اس نے ہاتھ فوراً پیچھے کر لئے۔

یہ فراق میں قالین بن گیا اور میں — ؟

پھر ہائے اللہ ! کہتے ہوئے یہ اشعار پڑھے۔

www.ksars.org

دردِ فرقت نہیں سہا جاتا
لیکن ان سے کہا نہیں جاتا
دردِ دل بھی کہیں محتاجِ بیاں ہوتا ہے
درد ہو دل میں تو چہرے سے عیاں ہوتا ہے
اب میرے دردِ محبت کا ٹھکانا مت پوچھ
اب یہ احساس نہیں کہ درد کہاں ہوتا ہے

میرے پاس اس کی باتوں کا جواب نہیں تھا۔ عاشقوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے جس میں قوانین بھی ان کے اپنے ہوتے ہیں۔ جانتا تھا کہ عشق تو جیہہ قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ وہ اٹھی اور بیگ سے جوڑا نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی، مرشد کے آستانے پر جارہے ہیں، یہ اپنی طرف سے ان کو دیجئے گا۔ میرا نام نہ لیجئے گا۔

میں نے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا، نام کیوں نہ لوں؟ میں تو بتاؤں گا کہ آپ کی بیٹی نے بھیجا ہے۔ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ وہ درد بھری مسکراہٹ سے بولی، اگر میری آواز ان تک نہیں جاتی تو بہتر ہے کہ ان کو یہ علم بھی نہ ہو کہ میری کوئی ہستی ہے۔ پھر تحفہ کیوں بھیج رہی ہو، تم تو جانتی ہو کہ وہ اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے۔

وہ بولی، ہر بات کا جواب نہیں ہوتا۔

وہ بہت مایوس تھی، میں جانے سے پہلے اس کو امید کی روشنی دکھانا چاہتا تھا۔ اس کے حالات نہیں بدل سکتا تھا لیکن موجودہ حالات میں اس کو جینے کی آس دینا چاہتا تھا۔ میں نے کہا، مرشد کی یاد دل کو راحت دیتی ہے، ان کی باتیں زندگی کے صحرا میں پھول ہیں، جذبات کی زمین ان کی یادوں سے سبزہ زار بن جاتی ہے پھر آنسو کیوں؟

وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی، کچھ مت کہیں، خاموش ہو جائیں، یہ وہ راستہ ہے جس میں اپنے کہے ہوئے الفاظ ستاتے بہت ہیں۔ جن کو زیارت نصیب ہو، وہ دل کا حال کیا جانیں۔ میرے لئے تو وہی ماں اور وہی باپ ہیں۔

www.ksars.org

میں بے چینی سے پہلو بدل کر خاموش ہو گیا۔ دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ اسٹیشن جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں جب کراچی جاتا ہوں، قرۃ العین کو خبر ہو جاتی ہے۔ وہ ملنے ضرور آتی ہے۔ میں نے بیگم اور بچوں کو الوداع کہا پھر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا، تم بہت پیاری بیٹی ہو، بہت اچھی بہن ہو، اس تکلیف کو امتحان سمجھو اور گزر جاؤ۔ اللہ کا فرمان ہے،

''پس یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔''
(الم نشرح : ۵۔۶)

یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل آیا۔ دل بھاری ہو گیا تھا۔ یہ کیسی محبت ہے کہ زندہ رہنا دشوار اور زندگی کا ہر لمحہ کرب بن جائے۔ ذہن میں ہزار باتیں آتی رہیں۔ دل کی باتیں دل سے سمجھی جاتی ہیں لیکن میں دماغ سے بہت دیر تک سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ عشق ظرف پیدا کرتا ہے اور جب تک ظرف نہیں بنتا، کم ظرفی سے پیمانے چھلک جاتے ہیں۔

لوگوں کی محبتوں کا قاصد بن کر جب مرشد کے پاس حاضر ہوا، پیغامات ان تک نہ پہنچا سکا۔ سب کہتے ہیں کہ میرا نام لے کر سلام پیش کرنا، یہ کہنا اور وہ کہنا جب کہ میرے اندر حجاب کے ہزاروں پردے ہیں۔ یہاں آتا ہوں تو زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ اپنی بات تک لب پر نہیں آتی۔ اور آئے بھی کیسے! دید کی پیاس لفظوں سے کبھی بجھی ہے — ؟

حکم ہوا کہ مہمان خانے میں انتظار کریں۔ شاپنگ بیگ جس میں جوڑا تھا، سامنے رکھا تو قرۃ العین کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ میں اکیلا نہیں تھا، اور لوگ بھی ملاقات کے منتظر تھے۔ خاموشی طاری تھی۔ اچانک دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور اندر میں برف پگھلنے لگی۔ آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ زمانے کو خبر کرنے کے لئے ایک آنسو گال پر بہہ گیا۔ تیزی سے گال پر ہاتھ پھیرا۔ یہ کیا ہوا — ؟ جیسے قرۃ العین آ کر براجمان ہوئی ہو اور پوچھ رہی ہو کہ ظرف کا سبق دینے والے! یہ کم ظرفی کیوں؟

ملاقات میں ایک منزل کا فاصلہ رہ گیا ہے، کون سا قرۃ العین کی طرح مبتلائے ہجر ہوں پھر اندر کی موجیں کس طوفان کی خبر ہیں؟ آنسو موتیوں کی لڑی بن گئے۔ مہمان خانے میں بیٹھے لوگوں کے لئے میرا رونا عجب نہیں تھا۔ یہاں آنے والے جانتے ہیں کہ یہ مہمان خانہ پروانوں کے لئے ہے، پروانہ آیا ہے، کوئی اندر میں روتا ہے اور کوئی باہر۔

www.ksars.org

جب میں نے قرۃ العین کی طرح سر گھٹنوں پر رکھا تو اس کا حال منکشف ہوا۔ جذبات کی رَو کا گزر ناضروری تھا، باہر آ کر ٹہلنے لگا، خود پر قابو پا چکا تو اندر آ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ دل پھر سے بھر آیا جیسے بند ٹوٹنے کے قریب ہو۔ ساتھ بیٹھے لوگوں سے باتوں میں خود کو مشغول کیا کہ شاید دل کا گداز ٹل سکے اور اس حال میں سامنے نہ جاؤں جس حال میں قرۃ العین میرے سامنے بیٹھی تھی۔ آخر کار دل کو قرار آ گیا۔

اتنے میں ڈیوٹی پر مامور صاحب آئے اور میرا نام پکارا۔ میں مسکراتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چل دیا، جذبات میں سکون تھا۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ متبسم چہرے کے ساتھ حاضر ہو رہا ہوں لیکن 21 سیڑھیاں گداز کا دریا بن گئیں۔ آج دل کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ بے نام درد نے سرایت کر کے مجھے قرۃ العین بنا دیا تھا۔ جب باپ سے زیادہ شفیق مرشد پر نظر پڑی تو میں بکھر گیا۔ جی چاہا کہ ان کے قدموں میں سر رکھوں اور روتا رہوں۔ خود کو سنبھال نہ سکا اور کچھ فاصلے پر بیٹھ کر بچوں کی طرح زار و قطار رو دیا۔ نہیں جانتا کہ یہ میرا حالِ دل تھا یا مجھے کسی کے حال کا قاصد بنا کر یہاں بھیجا گیا تھا۔ اندر میں آنکھ نے دیکھا کہ قرۃ العین دور کھڑی سکون و اطمینان سے مسکرا رہی تھی جیسے اس کا پیغام پہنچ گیا ہو۔

www.ksars.org

سہیل احمد

روح کی آواز

میلہ اپنی تمام تر سرگرمیوں اور مصروفیتوں کے بعد ختم ہو چکا تھا۔اس میلے کو پُشکر کا میلہ کہتے تھے اور یہ میلہ اجمیر شریف کے قریب منعقد ہوتا تھا۔میلے میں شرکت کے لئے آنے والے ایک خاندان کا تعلق ضلع ہزارہ سے تھا۔اس متمول اور امیر کبیر خاندان کے سربراہ نے اجمیر شریف پہنچ کر اپنی بیوی سے کہا!

"ہم اجمیر شریف آئے ہیں تو خواجہ صاحب کی درگاہ پر ضرور حاضری دینی چاہئے۔بیوی نے جواب دیا، ٹھیک کہتے ہیں۔میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ حضرت کی درگاہ کے درشن کرلوں۔دونوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ شریف جانے کی تیاری شروع کی تو ان کا چھ سات سالہ بیٹا بھی ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔

پتا جی، میں بھی درشن کے لئے جاؤں گا۔مجھے بھی لے چلیں۔باپ نے سمجھایا بیٹا، تم وہاں جا کر کیا کروگے۔لڑکا نہ مانا اور اس نے ساتھ جانے کی ضد جاری رکھی لیکن والدین کئی عُذر پیش کر کے اور اسے خادم کی نگرانی میں چھوڑ کر درگاہ خواجہ غریب نواز چلے گئے۔

بچے کو ساتھ نہ جانے کا بہت صدمہ ہوا۔اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ مسلسل روتے روتے اس کے اوپر نیند کا غلبہ ہو گیا اور وہ سو گیا۔خواب میں اس نے دیکھا کہ ایک نورانی شکل وصورت کے بزرگ اس سے کہہ رہے ہیں۔

"بیٹا! کیوں روتے ہو؟ تم میرے پاس نہیں آئے تو کیا ہوا۔میں خود تمہارے پاس آگیا ہوں"، بچے نے دریافت کیا، "آپ کون ہیں؟" بزرگ نے بتایا، بیٹا! میں وہی ہوں جس کے پاس تیرے ماں باپ گئے ہیں۔انہوں نے تجھے میرے پاس

www.ksars.org

نہیں آنے دیا۔اس لئے میں خود تیرے پاس آیا ہوں۔ تیرے ماں باپ تو مٹی کی دیواریں اور پتھر دیکھ کر واپس آجائیں گے لیکن تونے یہیں رہ کر مجھے دیکھ لیا ہے۔

بزرگ کے الفاظ میں ایک خاص اپنائیت اور کشش تھی اور ان کے وجود میں سے نکلنے والی نورانی لہریں بچے کو اپنے اندر جذب ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ یہ الفاظ ادا کر کے بزرگ واپس چلے گئے۔

بچہ نیند سے بیدار ہوا، اسے اپنے اندر لطافت اور احساس طمانیت کا بھرپور احساس ہوا۔ وہ خوش خوش کھیلنے میں مشغول ہو گیا۔ والدین واپس آئے تو بچے کو خوش دیکھ کر خیال کیا کہ بچہ کھیل میں اپنی ضد بھول چکا ہے۔ چند روز بعد یہ خاندان واپس اپنے وطن چلا گیا۔ اس لڑکے کا نام راجیش تھا۔

دن گزرتے رہے اور راجیش اسکول کا زمانہ گزار کر کالج میں جا پہنچا۔ راجیش ایک سمجھدار نوجوان تھا اور اس کے اندر ایک خاص قسم کی کشش تھی جس سے لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

کالج میں وہ ایک ذہین اور محنتی طالب علم شمار ہوتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ روزانہ صبح ہلکی ورزش کرتا اور دوڑ لگاتا تھا۔ صبح جب وہ پشاور چھاؤنی کے قریب سے گزرتا تو اکثر ایک انگریز لڑکی گھوڑا دوڑاتی ہوئی قریب سے گزر جاتی تھی۔ یہ لڑکی گھوڑا دوڑاتی ہوئی قریب سے گزر جاتی تھی۔ یہ لڑکی نہایت معصوم اور حسین تھی۔ راجیش کو اس لڑکی کے اندر اپنے لئے نامعلوم کشش محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایک ہندوستانی نوجوان تھا اور لڑکی انگریز تھی اور ضرور کسی بڑے افسر کی لڑکی تھی۔ اگرچہ لڑکی حاکم قوم سے تعلق رکھتی تھی اس کے باوجود راجیش توجہ ہٹانے کی بجائے اس میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ اکثر کھڑا ہو جاتا اور لڑکی گھوڑے پر سوار اسے دیکھتی ہوئی گزر جاتی۔

ایک بار کسی دوست کے ساتھ وہ کلب گیا جہاں دوست کے والد ملازم تھے۔ وہ استقبالیہ کے ایک طرف کھڑا تھا کہ اندر اسے وہی لڑکی نظر آئی جسے وہ روز گھوڑے پر سوار گزرتے دیکھتا تھا۔ لڑکی کی نظریں بھی اس سے چار ہوئیں۔ لڑکی کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر قریب آکر اس سے پوچھا!

www.ksars.org

''میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔''

''آپ کا خیال درست ہے۔ میں روز صبح ورزش کے لئے نکلتا ہوں۔ اس وقت آپ گھڑسواری کرتی ہیں۔ ہمارا سامنا پشاور چھاؤنی کے پاس ہوتا ہے۔''

ٹھیک کہہ رہے ہو مجھے یاد آ گیا۔ یہ بتاؤ تم یہاں کیسے آئے ہو؟

میرے دوست کے والد یہاں ملازم ہیں اور دوست اپنے والد سے ملنے آیا ہے۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟ راجیش نے سوال کیا۔ اسی وقت لڑکی نے دور سے ایک انگریز کو آتا دیکھ کر کہا، سوری! ڈیڈی آرہے ہیں اور دوڑتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔ پھر وہ دونوں مرکزی دروازے سے نکل کر چلے گئے۔

چند روز بعد راجیش صبح کے وقت چھاؤنی کے قریب سے گزرا تو بے اختیار اس کی متجسس نگاہیں راستے پر لڑکی کو تلاش کرنے لگیں۔ اچانک وہ اسے گھوڑے پر سوار درختوں کے درمیان سے نکلتے ہوئے دکھائی دی، لڑکی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار آہستہ کی اور راجیش کے قریب پہنچ گئی۔

ہیلو مسٹر۔۔ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مجھے راجیش کہتے ہیں۔ راجیش نے اپنا تعارف کرانے کے بعد اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا، لڑکی نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔ میرا نام کیتھی ہے۔ میرے ڈیڈی میجر ولیم پشاور میں تعینات ہیں۔ کیا تم پڑھ رہے ہو؟

راجیش نے بتایا کہ وہ کالج کا طالب علم ہے۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کافی آگے نکل گئے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور واپس ہو گئے۔

پھر اکثر دونوں اسی طرح ملتے اور باتیں کرتے ہوئے شہر کے نواح تک چلے جاتے۔ راجیش کو کیتھی میں خاص کشش اور اپنائیت محسوس ہوتی تھی اور کیتھی بھی راجیش کے اندر ایک مقناطیسی قوت محسوس کرتی تھی۔

www.ksars.org

راجیش کے امتحانات قریب آ گئے تھے۔ایک دن وہ رات کو دیر تک پڑھتا رہا، رات کو بستر پر لیٹا تو پریشان تھا کہ کہیں صبح آنکھ نہ کھلے اور وہ کیتھی سے ملنے نہ پہنچ سکے۔ علی الصبح بہت سویرے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی، یوں لگا جیسے کسی نے ہوشیار کر دیا ہے۔ وہ وقت سے پہلے بیدار ہو گیا تھا۔ کپڑے بدل کر باہر نکلا اور مقررہ جگہ پر پہنچا۔ کیتھی بھی آ پہنچی۔ راجیش نے اسے بتایا، میرے امتحانات ہونے والے ہیں اور امتحانات کے بعد مجھے دو ماہ کے لئے ہزارہ جانا ہو گا۔ گھر والے میرا انتظار کر رہے ہیں۔

کیتھی اداس ہو گئی، راجیش کے لئے بھی اس سے جُدائی کا تصور سوہانِ روح تھا۔ وہ خاموش کھڑا سوچ رہا تھا کہ کاش یہ چھٹیاں کبھی نہ آتیں اور کیتھی کے قُرب سے محروم نہ ہوتا۔ کیتھی نے کچھ سوچ کر کہا، میں تمہیں اپنی سہیلی کا پتہ دے دیتی ہوں۔ تم اس پتے پر خط لکھتے رہنا۔ دو ماہ کی تو بات ہے وقت گزر جائے گا۔

امتحانات ختم ہوئے اور وطن چلا گیا۔ اس نے پہنچتے ہی خط لکھا اور کیتھی کا جوابی خط آ گیا۔ دوسرا خط روانہ کیا لیکن اس کا جواب نہیں ملا، وہ پریشان ہو گیا اور طرح طرح کے خدشات دل میں پیدا ہونے لگے۔ بڑی مشکلوں سے چھٹیاں گزار کر واپس پشاور پہنچا۔ واپسی کے دوسرے دن اسے ایک شخص نے پیغام دیا،

''میجر ولیم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ شام کو ان کے بنگلے پر آ جائیے گا۔''

راجیش مقررہ وقت پر میجر ولیم کے بنگلے پر پہنچا تو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد میجر ولیم اندر داخل ہوا اور اس کے پیچھے کیتھی بھی اندر آئی۔ میجر نے ایک خط کیتھی کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا،

کیا یہ خط تمہارے لئے ہے؟

کیتھی نے خط دیکھتے ہوئے کہا، جی ہاں۔

میجر نے غصے سے پوچھا، ایسا کیوں ہے؟

www.ksars.org

کیتھی نے جواب دیا،اس لئے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

میجر نے راجیش کے سامنے اس کا لکھا ہوا خط کرتے ہوئے پوچھا،

کیا یہ خط تمہارا ہے؟

راجیش نے بھی اسی طرح کہا،جی ہاں۔

اس جواب پر میجر ولیم نے اگلا سوال کیا،تم نے یہ خط کیوں لکھا ہے؟

راجیس نے کہا،میں کیتھی سے محبت کرتا ہوں۔

میجر ولیم اپنی بیٹی کی طرف پلٹا اور کہا، کیتھی! ایک بات اچھی طرح سن لو۔ابھی تمہاری عمر کم ہے اور تم دو برس بعد خود اختیاری کی عمر کو پہنچو گی۔دو برس تک میں تمہارا سرپرست ہوں۔اس وقت تک تم اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتیں،اس کے بعد تمہاری مرضی ہے جو چاہے کر لینا۔لیکن دو برس تک تم میرے فیصلے کی پابند ہو۔دو برس تک اس لڑکے سے ملنا اور خط لکھنا بند کر دو۔

پھر میجر ولیم راجیش کی طرف پلٹا،

نوجوان! کیتھی کے سرپرست کی حیثیت سے میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم دو سال تک نہ اس سے ملوگے اور نہ خط لکھوگے ۔اگر میں نے تمہیں اس سے ملتے ہوئے دیکھ لیا یا اپنے بنگلے کے قریب بھی دیکھا تو بے دریغ گولی مار دوں گا،اب تم جا سکتے ہو۔

راجیش نے کیتھی کی طرف دیکھا اور کیتھی نے راجیش کی طرف دیکھ کر نظریں نیچی کر لیں، راجیش دل پر پتھر رکھ کر واپس آگیا۔وہ سوچ رہا تھا کہ دو سال کا عرصہ زیادہ نہیں ہوتا۔جب یہ عرصہ گزر جائے گا تو وہ اور کیتھی ملنے کے لئے آزاد ہوں گے اور زندگی کا فیصلہ کر سکیں گے۔

www.ksars.org

راجیش اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول ہوگیا اور مختلف ذرائع سے کیتھی کا حال اور اس کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ کیتھی انگلستان چلی گئی ہے جب کہ اس کا باپ میجر ولیم ہندوستان میں موجود ہے۔ اس خبر سے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ یوں لگا جیسے حالات اس کے بس سے باہر ہوتے جا رہے ہیں اور وہ حالات کے سامنے مجبور ہوتا جا رہا ہے۔ اسے یقین ہونے لگا کہ اب وہ کیتھی کو کبھی نہ دیکھ سکے گا، اس کیفیت میں چار پانچ دن گزر گئے۔ کھانا پینا بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا اور ذہن میں ہر وقت کیتھی کا خیال رہنے لگا۔ ایک دن اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کا کوندا بن کر وارد ہوا اور اس کے دل کو قدرے اطمینان حاصل ہوا۔

وہ جب چھٹیوں پر اپنے گھر پہنچا تو ایک مناسب وقت پر اپنے والد سے کہا،

پتا جی! میری کالج ایجوکیشن ختم ہونے والی ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے طب کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیج دیں۔

باپ نے راجیش کی طرف حیرت سے دیکھا اور سمجھاتے ہوئے کہا،

بیٹا! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستان میں میری بڑی جائیداد، املاک اور کاروبار ہے۔ تمام املاک اور کاروبار کی دیکھ بھال اور انتظام کے لئے مستقل توجہ کی ضرورت ہے۔ میں اپنی عمر کے تقاضے کی وجہ سے اس پر متواتر توجہ نہیں دے سکتا۔ تمہیں چاہئے کہ کاروباری معاملات کو سیکھو، سمجھو اور اس کا انتظام سنبھال لو۔

راجیش باپ کے فیصلے سے متفکر ہوگیا اور کہا، پتا جی! کاروبار اور جائیداد وقتی طور پر چھوڑ کر جاؤں گا، اس کا انتظام عارضی طور پر کوئی اور بھی سنبھال سکتا ہے۔ طب میرا شوق ہے اور مجھے اس سے بہت دلچسپی ہے، میں اس علم کو ضرور سیکھنا چاہتا ہوں۔

باپ نے کئی بار سمجھایا لیکن راجیش مسلسل ضد کرتا رہا۔ بالآخر مجبور ہو کر اجازت دے دی اور راجیش انگلستان چلا گیا۔ انگلستان پہنچ کر تعلیم کے ساتھ ساتھ پوری سرگرمی سے کیتھی کو تلاش کرنے لگا۔ اس نے ہندوستان میں متعین فوجی افسروں کے نام اور ان کی موجودہ پوسٹنگ معلوم کرائی۔ بالآخر اسے معلوم ہوا کہ میجر ولیم ریٹائرڈ ہوگیا ہے اور ان دنوں

www.ksars.org

انگلستان میں موجود ہے۔ ان تمام واقعات اور تلاش میں دو سال گزر چکے تھے۔ ایک دن اس نے کیتھی کا پتہ بھی معلوم کر لیا۔

ہفتہ کے آخری ایام میں وہ اپنے شہر سے کیتھی کے رہائشی قصبے میں پہنچا۔ وہ اچانک کیتھی سے مل کر اسے حیرت زدہ کر دینا چاہتا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بجائی، کیتھی نے ہی دروازہ کھولا اور اسے سامنے دیکھ کر حیرت اور خوشی سے بے حال ہو گئی۔ وہ دونوں خوش خوش باغ میں پہنچے۔ کیتھی نے کہا،

راجیش! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم مجھے بھول چکے ہو گے۔ وہ کیسے؟ راجیش نے سوال کیا۔

انسان وقتی جذبات میں بہت سی باتیں کہتا ہے لیکن بدلتے حالات میں اس کے خیالات و جذبات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔

راجیش نے مسکرا کر کہا، ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ وقت تمہیں بتائے گا۔

کیتھی نے مسکرا کر کہا، یہ تو بتاؤ تم یہاں کس طرح آ گئے؟ یہ بات تو میں پوچھنا بھول گئی۔ راجیش نے کہا، تمہاری تلاش مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ میں میڈیکل پڑھ رہا ہوں اور لندن میں قیام ہے۔ میں نے والد کو مجبور کیا وہ مجھے میڈیکل کی تعلیم کے لئے لندن بھیج دیں اور بالآخر میں نے انہیں راضی کر لیا۔ مقصد یہ تھا کہ میں یہاں پہنچ کر تم سے مل سکوں اور پھر مسلسل تلاش کے بعد میں نے تمہیں ڈھونڈ نکالا۔

کیتھی راجیش کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے مسکرائی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ وہ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ راجیش بہت مسرور تھا اور خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

وہ واپس لندن پہنچا تو چند روز بعد کیتھی کا خط آ پہنچا۔ خط دیکھ کر راجیش فکر مند ہو گیا لیکن خط کھول کر پڑھا تو مسکرا دیا۔ کیتھی نے اس کا حال معلوم کرنے کے لئے خط لکھا تھا۔ لیکن خط کے الفاظ میں کیتھی کی وارفتگی و شیفتگی چھپی ہوئی تھی۔ راجیش سے صبر نہ ہو سکا اور وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی کیتھی سے ملنے پہنچ گیا۔ اس نے کیتھی سے کہا،

www.ksars.org

کیتھی! میں تمہارے خط کے جواب میں خود آگیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے مستقبل کے بارے میں حتمی فیصلہ جلد کر لینا چاہئے۔

کیتھی نے کہا، راجیش جلدی نہ کرو میں کسی مناسب وقت کے انتظار میں ہوں۔ ڈیڈی سے بات کروں گی۔

راجیش خاموش ہو گیا۔

میجر ولیم کو راجیش کی انگلستان آمد اور کیتھی سے ملاقاتوں کی خبر ہو چکی تھی۔ ایک دن اس نے کیتھی سے کہا، کیتھی! میرا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ تمہیں عقل آجائے گی اور تم زندگی کے معاملات کو بہتر سمجھنے لگو گی لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ابھی تک بچپن کے دور سے نہیں نکل سکی ہو۔

کیتھی نے جواب دیا، ڈیڈی! میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کا اشارہ میری اور راجیش کی دوستی کی طرف ہے۔

میجر ولیم نے بات کاٹتے ہوئے کہا، بات صرف دوستی تک ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن دوستی سے آگے بڑھ کر شادی کا فیصلہ میرے خیال میں تمہاری بہت بڑی غلطی ہو گا۔

کیتھی نے کہا، ڈیڈی! راجیش ایسا نہیں ہے۔ آپ اس سے مل کر دیکھیں۔ آپ خود کو وسیع الخیال کہتے ہیں پھر اس معاملے میں آپ کا رویہ مختلف کیوں ہے؟

بیٹی! اس معاملے کا وسیع الخیال ہونے سے تعلق نہیں ہے۔ تمہاری عمر کم ہے اور تم ابھی ناسمجھ ہو۔ جذبات کے ذریعے سوچ رہی ہو لیکن میں حقائق کی روشنی میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ میں ہندوستان میں کافی عرصہ رہا ہوں اور وہاں کے لوگوں کی نفسیات بھی سمجھتا ہوں اور ان کے سماجی اور معاشی حالات سے بھی باخبر ہوں۔

میجر ولیم اپنی بیٹی کو مسلسل سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا، راجیش ایک امیر کبیر خاندان کا فرد ہے۔ اگر اس کے باپ نے جائیداد اور روپے پیسے کو ایک طرف رکھ دیا تو وہ بدل بھی سکتا ہے۔ امیر خاندان کے لڑکے جوانی میں محبت کا کھیل کھیلتے ہیں اور

www.ksars.org

وقت آنے پر بدل جاتے ہیں۔اس سے تمہیں جو ذہنی و جذباتی صدمہ ہوگا، وہ میرے لئے بھی شدید روحانی اذیت کا باعث بنے گا۔

کیتھی نے باپ سے کہا، ڈیڈی! راجیش ایسا نہیں ہے۔ میں اسے اچھی طرح پرکھ چکی ہوں۔ وہ روپے پیسے کے لئے بدلنے والا شخص نہیں ہے۔

میجر ولیم نے مزید کہا، دوسری بات یہ ہے کہ ہماری معاشرتی اقدار اور ان کے سماجی حالات میں بھی فرق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے لوگ عورت کے مقام کو جس نظر سے دیکھتے ہیں، یورپ کے لوگوں کا نقطۂ نظر اس سے الگ ہے۔ تم ہندوستان کے ایک خاندان کا فرد بن کر خود کو مجبور محسوس کروگی اور رفتہ رفتہ تمہیں تنہائی اور مشکلات کا احساس ہوگا۔ راجیش تم سے کتنا ہی مخلص سہی لیکن وہ خاندانی روایات اور معاشرتی اقدار تو نہیں بدل سکتا۔ وہ جب ان روایات کی پاس داری کرے گا تو اس وقت تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔

کیتھی نے باپ کی تمام باتوں کے جواب میں کہا، ڈیڈی! ضروری نہیں کہ راجیش بھی یہ سب کچھ کرے اور میرے لئے سب سے اہم راجیش کا ساتھ ہے۔ اس کے آگے ساری باتیں ثانوی ہیں۔

باپ بیٹی کی یہ گفتگو کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوگئی۔

راجیش اور کیتھی کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ راجیش نے ایک بار پھر کیتھی سے پوچھا، کیتھی نے مسکراتے ہوئے کہا راجیش، جلد بازی سے کام نہ لو۔ میں ڈیڈی کو سمجھا رہی ہوں کہ وہ بھی ہمارے فیصلے کو خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے اس کی تائید کردیں۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ بھرپور شفقت دی ہے۔ اگرچہ وہ ذرا سخت طبیعت کے مالک ہیں لیکن اپنی بات پر بے جا ضد کرنے والے نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ ہمارے فیصلے کو اس لئے قبول نہیں کررہے ہیں کہ وہ اس میں میرے لئے مشکلات اور نقصان تصور کررہے ہیں، نتائج کا خوف ان کے راضی ہونے میں رکاوٹ ہے، مخالفت کی اور کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں انہیں راضی کرنا چاہتی ہوں تاکہ وہ بھی خوش دلی سے ہمارے فیصلے میں شریک ہوسکیں۔ میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی۔

www.ksars.org

راجیش نے کہا، کیا تم نے انہیں نہیں بتایا کہ میں اس معاملے میں کتنا سنجیدہ ہوں اور اگر وہ راضی نہ ہوئے تو؟

کیتھی نے راجیش کو سمجھایا، راجیش میں انہیں قائل کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہوں، مجھے امید ہے کہ وہ مان جائیں گے۔

اس طرح کئی ماہ گزر گئے لیکن میجر ولیم راضی نہ ہوا۔ ایک دن کیتھی اور راجیش ملے تو پھر یہ معاملہ زیرِ غور آیا۔ کیتھی نے کہا،

میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔ میں بیمار بن جاتی ہوں۔ ہمارے فیملی ڈاکٹر بہت اچھے خیالات کے مالک ہیں اور انہیں اس معاملے کا علم ہے۔ میں کسی موقع پر انہیں قائل کرلوں گی کہ ڈیڈی کو میری بیماری کے حوالے سے سمجھائیں کہ اگر ہماری شادی نہ ہوئی تو یہ جذباتی صدمہ میری زندگی بھی لے سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈیڈی میری زندگی کو داؤ پر نہیں لگائیں گے۔

دن بدن کیتھی کی خاموشی بڑھتی گئی اور اس نے زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ خوش مزاج اور شگفتہ طبیعت بیٹی کو جب اُداس و خاموش دیکھا تو میجر ولیم مضطرب ہو گیا۔ اور پھر ایک دن جب کیتھی کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ بستر سے لگ گئی تو اس نے فوراً فیملی ڈاکٹر کو بلوالیا۔ کئی بار کے معائنے کے بعد ایک دن ڈاکٹر نے میجر ولیم سے کہا،

میجر صاحب! میرا خیال ہے کہ کیتھی ذہنی و نفسیاتی دباؤ کا شکار ہے۔ اگر یہ کیفیت برقرار رہی تو نروس سسٹم پر بھی ناخوشگوار اثرات مرتب ہو سکتے ہیں بلکہ خدانخواستہ کوئی شدید مرض بھی لاحق ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے تو کبھی میں نے کیتھی کو اس طرح کی حالت میں نہیں دیکھا۔

میجر ولیم اس نئے انکشاف سے بے حد پریشان ہو گیا۔ کیوں کہ بات اس کی بیٹی کی زندگی تک جا پہنچی تھی۔ وہ اب تک جو مخالفت کر رہا تھا اس کی وجہ بیٹی کی کامیاب اور خوش گوار زندگی تھی لیکن اب اس کی زندگی داؤ پر لگ گئی تھی۔ وہ میڈیکل کالج گیا جہاں راجیش زیرِ تعلیم تھا۔ پرنسپل اور اساتذہ سے راجیش کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کئے۔ اور اس

www.ksars.org

معاملے کو رازداری میں رکھا۔ پھر وہ ہوسٹل کی مالکہ کے پاس گیا جہاں راجیش ٹھہرا ہوا تھا۔ ہوسٹل کی مالکہ سے بھی راجیش کی تمام سرگرمیوں اور اس کے کردار کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

اس کاروائی کے بعد میجر ولیم کئی دن غور و فکر میں ڈوبا رہا اور پھر ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ راجیش کے پاس پہنچا۔ راجیش نے اسے اپنے کمرے میں بٹھایا۔ میجر نے کہا:

میں چاہتا ہوں کہ پندرہ دن کے لئے تم میرے ساتھ سیاحت کے لئے چلو۔

راجیش میجر ولیم کی اس پیشکش پر حیران بھی ہوا اور متذبذب بھی۔ اس نے کہا،

میجر صاحب! میں کس طرح جا سکتا ہوں۔ میرے امتحانات قریب آرہے ہیں اور مجھے تیاری کرنی ہے، ان حالات میں مجھے چھٹی بھی نہیں مل سکے گی۔

میجر ولیم نے کہا، زیادہ فعال بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہارے پرنسپل سے رُخصت لے چکا ہوں لٰہذا فوراً تیار ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر اس نے راجیش کو چھٹی کی اجازت نامہ دکھایا۔ راجیش کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس پیشکش کو کیا معانی پہنائے۔ بالآخر اس نے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا اور نہانے کے لئے واش روم چلا گیا۔

اس دوران میجر ولیم نے راجیش کے کمرے کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ چابیوں سے اس کی الماری کھول کر تمام چیزوں کا بغور جائزہ لیا۔ اس کو کوئی ایسے شے نہ مل سکی جس سے راجیش کے بارے میں غلط تاثر قائم ہو سکے۔ ایک بکس میں اسے وہ تمام خطوط بھی ملے جو اس کی بیٹی کیتھی نے راجیش کو لکھے تھے۔ وہ غسل خانے سے نکلا اور تیار ہوا تو میجر نے اسے بٹھا کر کہا،

راجیش! مجھے معلوم ہے کہ کیتھی اور تم عمر کے جس دور میں ہو اس میں جذبات زیادہ ہوتے ہیں اور عقل کا دخل کم ہوتا ہے۔ اس بات پر ایک بار پھر غور کر لو جب تمہارے باپ کو معلوم ہوگا کہ تم نے انگلستان میں ایک غیر ہندو لڑکی سے شادی کر لی ہے تو وہ کتنا ناراض ہوگا۔ وہ تمہیں جائیداد اور کاروبار سے بھی بے دخل کر سکتا ہے۔ تم انگلستان میں شاید مستقل نہ رہ سکو کہ یہاں کا موسم اور یہاں کا طرز زندگی تمہیں اچھی نہ لگے اس لئے کہ تم اندر سے تو ایک ہندوستانی ہو۔

www.ksars.org

کیتھی ابھی ہندوستان کی تہذیب سے ناواقف ہے، وہ ہندوستانی تہذیب اور ہندوستان کی آب و ہوا میں کس طرح رہ سکے گی۔ تم دونوں کی زندگی خراب ہو جائے گی۔

راجیش نے مسکرا کر کہا، میجر صاحب! ہم نے ان باتوں پر اچھی طرح غور کر لیا ہے آپ کو ان باتوں کی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔

میجر نے راجیش کو ساتھ لیا اور اپنے گھر لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ ابھی وہ نیچے ہی تھا کہ اوپر سے کیتھی کی آواز آئی،

ڈیڈی! آپ میرے لئے کچھ لائے ہیں؟۔

میجر ولیم نے کہا، میں تمہارے لئے جو کچھ لایا ہوں وہ تم ڈرائنگ روم میں جا کر دیکھ سکتی ہو۔

کیتھی تجسس کے عالم میں تیزی سے سیڑھیاں اُترتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی تو راجیش کو دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں میجر ولیم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس نے راجیش سے کہا،

راجیش! جب تم کیتھی سے اتنی محبت کرتے ہو تو تم عیسائیت اختیار کر لو تاکہ مذہبی فرق تم دونوں کے درمیان اختلاف نہ پیدا کر سکے۔

راجیش نے کیتھی کی طرف دیکھا تو اس نے باپ کی تائید میں سر ہلا دیا۔ راجیش نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا،

آپ کو معلوم ہے کہ میں مذہبی طور پر شدت پسند نہیں ہوں اور میرا مسلک انسانیت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسانیت کسی بھی مذہب میں رہ کر اختیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ میرا امتحان لینا چاہتے ہیں تو مجھے عیسائی ہونے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

میجر ولیم اور کیتھی دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے۔ وہ سب ساتھ چرچ گئے جہاں راجیش نے عیسائیت اختیار کر لی اور پھر کیتھی سے اس کی شادی ہو گئی۔

www.ksars.org

راجیش اور کیتھی دونوں بہت خوش تھے اور دونوں کے دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔ شادی کے ایک سال بعد کسی نے راجیش کے والد کو سب حالات لکھ دیے کہ تمہارا لڑکا عیسائی ہو گیا ہے اور انگریز لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ راجیش کا باپ سخت غصہ ہوا اور اس نے راجیش کا خرچ بھیجنا بند کر دیا۔ معاشی پریشانی پیدا ہوئی کیونکہ ابھی راجیش تعلیم کے مراحل طے کر رہا تھا۔ میاں بیوی دونوں فکر مند رہنے لگے۔ ایک روز میجر ولیم ان کے پاس آیا اور ایک لفافہ انہیں دے کر کہا،

یہ لفافہ کیتھی کی والدہ کی طرف سے ہے اور تم دونوں اس کے مالک ہو۔

بعد میں جب لفافہ انہوں نے کھولا تو اس میں ایک خطیر رقم کا چیک موجود تھا۔ دونوں بہت خوش ہوئے اور پھر آسائش کی زندگی گزارنے لگے۔ اس خوش و خرم زندگی میں ان کے کئی بچوں کی پیدائش ہوئی اور راجیش نے طب کا امتحان پاس کر کے پریکٹس بھی شروع کر دی۔

ایک رات راجیش سویا تو اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک نورانی صورت شخصیت اس کے سامنے موجود ہے۔ انہوں نے راجیش سے کہا!

تم نے اپنی زندگی کا ایک دور خوش و خرم گزار لیا۔ اب اگلے مرحلے کے لئے یہاں ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

راجیش نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا!

آپ ہیں کون؟

نورانی چہرہ بزرگ نے کہا!

یاد کرو جب تم چھوٹے تھے اور تمہارے ماں باپ تمہیں روتا چھوڑ کر اجمیر ہمارے پاس آگئے تھے لیکن ہم خود تمہارے پاس آئے تھے۔

www.ksars.org

بزرگ کے ان الفاظ کے ساتھ ہی راجیش کے ذہن میں ایک فلم سی چل پڑی اور وہ تمام باتیں اس کے سامنے سے گزر گئیں جن کا تذکرہ بزرگ نے کیا تھا۔اسے اجمیر شریف کا واقعہ یاد آگیا کہ وہ ایک کمرے میں روتا ہوا سو گیا تھا اور پھر اس نے عالم تصور میں ہی دیکھا کہ یہی بزرگ اس سے اپنا تعارف کرا رہے ہیں۔

خواب دیکھتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔رات کا پچھلا پہر تھا اور ہر سو سناٹا چھایا ہوا تھا۔کیتھی اس کے برابر لیٹی بے خبر سو رہی تھی۔راجیش نے چاہا کہ کروٹ بدل کر سو جائے لیکن خواب کا تاثر اتنا گہرا تھا کہ اس کی نیند اُڑ چکی تھی اور وہ خواب کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔خواب بار بار خود کو دُہرا رہا تھا۔راجیش کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اجمیر شریف میں ایک مسلمان مہاتما کا مزار ہے جن سے ہندو اور مسلمان دونوں عقیدت رکھتے ہیں۔راجیش مذہبی معاملات اور مافوق الفطرت واقعات پر زیادہ یقین نہیں رکھتا تھا۔ایک طبیب ہونے کی وجہ سے بھی وہ ان چیزوں کا قائل نہیں تھا اور اسے انسانی ذہن کا ایک خیالی مظہر سمجھتا تھا۔

لیکن یہ خواب دیکھنے کے بعد وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔آخر اس نے ایسا خواب کیوں دیکھا ہے۔کافی دیر غور کرنے کے بعد راجیش نے اپنے ذہن میں خواب کی تعبیر نکال لی۔وہ سوچنے لگا خواب و خیالات انسانی خواہشات اور دبی ہوئی آرزوؤں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔جب انسانی خواہش حد سے زیادہ ہو جاتی ہے تو انسان اسے خواب میں پورا ہوتا دیکھ کر آسودگی حاصل کر لیتا ہے۔بچپن میں جب میرے ماں باپ نے مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے اور میں ساتھ جانے کی گہری خواہش لئے سو گیا تو خواب میں اپنی خواہش کو نورانی شکل بزرگ کی صورت میں دیکھ لیا۔پھر سالہا سال گزرنے کے بعد اس سے ملتا جلتا منظر دیکھنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وطن کی یاد اور وطن سے تعلق کے خیالات پھر ایک مرتبہ میرے اندر متحرک ہو گئے ہیں۔اسی لئے میں نے ایک بار پھر بچپن کے واقعے کو دوبارہ اس طرح دیکھ لیا ہے اور یہ سب کچھ وطن سے تعلق کی وجہ سے ہے۔راجیش نے یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد اپنے دل کو تسلی دی کہ یہ سب محض خیالی باتیں ہیں اور پھر وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔

کچھ عرصہ بعد راجیش نے خواب میں دوبارہ انہی بزرگ کو دیکھا۔بزرگ نے کہا،

www.ksars.org

ہر بات کے لئے وقت مقرر ہے اگر تم نے وقت پر قدم نہ اُٹھایا اور ہمارے پاس نہیں آئے تو مشکلات میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

راجیش نے خواب کو ایک بار پھر اپنے خیالات اور خواہشات کا اعادہ سمجھ کر اسے رد کر دیا اور اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔
کچھ عرصہ بعد بزرگ تیسری بار خواب میں دکھائی دیے۔ان کے اطوار بدلے ہوئے تھے اور لہجے میں سختی تھی۔فرمایا،

تمہارے لئے جو امر مقرر ہے وہ بہر حال پورا ہونا ہے۔اگر مخالفت کی راہ پر چلو گے تو مصائب اور حالات خود تمہیں صحیح راستے پر لے آئیں گے۔تمہارے پاس ایک ماہ کی مہلت ہے۔

راجیش چونک کر اُٹھ بیٹھا اس نے خواب کے بارے میں ایک بار پھر بے توجہی برتی۔اس کے پاس کیتھی تھی، معاشرے میں ایک مقام تھا، معاشی فراخی تھی پھر اس کی تعلیم اور ماحول کا پس منظر بھی اس کے فیصلے کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ بالآخر اس نے خواب کو ذہنی پریشانی کا شاخسانہ قرار دے کر اسے فراموش کر دیا۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس کا بچہ بیمار ہو گیا۔وہ خود ڈاکٹر تھا اور مختلف امراض کے ماہر ڈاکٹر اس کے دوست تھے لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بیماری کی کیا وجہ ہے۔ پھر ایک دن اس کا بیٹا اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بیٹے کی وفات سے راجیش صدمے سے بے حال ہو گیا۔کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ بیٹی بھی ناگہانی طور پر انتقال کر گئی۔راجیش کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

راجیش اور کیتھی دونوں بے حد اُداس رہنے لگے۔ کیتھی کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور وہ بستر سے لگ گئی۔راجیش ہر طرح سے اس کی دل جوئی کرتا، گھنٹوں پاس بیٹھتا۔ وہ دونوں گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے لیکن کیتھی کی کھوئی ہوئی صحت واپس نہیں آئی۔ایک دن راجیش کی نظریں کیتھی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور ماضی کے واقعات ایک ایک کر کے چشم تصور کے سامنے سے گزر رہے تھے۔نوجوانی میں کیتھی سے ملاقاتیں، پھر انگلستان میں کیتھی سے ملاپ اور پھر شادی، اور شادی کا ابتدائی خوش و خرم عرصہ سب ایک ایک کر کے اس کے سامنے آرہا تھا۔ کیتھی کا حسین، شگفتہ اور

www.ksars.org

معصوم چہرہ زمانہ کے نشیب و فراز سے گزر کر اپنی دل کشی کھو چکا تھا۔ کیتھی نے راجیش کو پریشان سوچتے ہوئے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں، راجیش سے کہا،

راجیش! مجھے معلوم ہے کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ تمہیں یاد ہے کہ شادی کے لئے میں نے بیماری کا بہانہ بنایا تھا اور ایک عرصہ تک بیمار بنی رہی تھی لیکن آج میں سچ مچ بیماری کے شکنجے میں گرفتار ہو گئی ہوں، نکلنا چاہتی ہوں لیکن نکل نہیں سکتی۔ کبھی کبھی میں اپنے اندر موت کے سائے لہراتے محسوس کرتی ہوں۔ راجیش میں تم سے جدا ہونا نہیں چاہتی، کیا مجھے اس بیماری سے نجات نہیں ملے گی، تم مجھے سچ سچ بتادو۔

راجیش کے آنسو بہنے لگے۔ نہیں کیتھی! تم ایسی باتیں نہ کرو، تم ضرور اچھی ہو جاؤ گی۔ انسان کبھی بیمار ہو جاتا ہے اور پھر صحت بھی ہو جاتی ہے، تم اچھی ہو جاؤ گی۔ جب تم اچھی ہو جاؤ گی تو تمہیں یہ بیماری ایک خواب معلوم ہو گی۔ راجیش یہ باتیں کہہ رہا تھا لیکن اس کے دل میں خوشی کا عنصر مفقود تھا۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے سے خود بھی قاصر تھا۔ ایک دن کیتھی کی طبیعت بگڑ گئی، راجیش نے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کیتھی کی نگاہیں راجیش کے چہرے پر مرکوز تھی اور آنکھوں کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں، راجیش روتے روتے بے ہوش ہو گیا۔

راجیش کی دماغی حالت صدمے سے بُری ہو گئی۔ ایک عرصہ تک وہ ذہنی و جسمانی طور پر بیمار رہا۔ میجر ولیم نے ہر ممکن حد تک اس کا علاج کرایا لیکن اس کی طبیعت بحال نہ ہوئی۔ ڈاکٹروں نے میجر ولیم سے کہا، ہمارے خیال میں ان کو ہندوستان لے جائیں۔ وہاں کی آب و ہوا اور ماحول سے ان کا دل بہل جائے گا۔ یہاں رہ کر شاید ان کے اندر ماضی کی تلخیاں اور غم ہمیشہ کے لئے نشتر کا کام کرتے رہیں گے۔

راجیش ہندوستان آ گیا اور کچھ ہی عرصے میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اس نے عیسائیت سے متعلق تبلیغی مشن میں شمولیت اختیار کر لی اور مذہبی تبلیغ شروع کر دی۔ اس دوران اس نے دو شادیاں بھی کیں لیکن کوئی بیوی زندہ نہ رہی۔ ایک بار وہ تبلیغی

www.ksars.org

دورے پر امرتسر گیا۔امرتسر اس زمانے میں مذہبی مناظروں کا مرکز تھا۔ایک مناظرے کے دوران کسی عیسائی مبلغ نے راجیش کا حوالہ دیتے ہوئے کہا،

آپ کے سامنے یہ صاحب موجود ہیں۔پہلے یہ ہندو تھے لیکن جب عیسائی مذہب کا مطالعہ کیا تو عیسائیت کی سچائی ان پر ظاہر ہوگئی اور یہ عیسائی ہوگئے۔یہ بہت پڑھے لکھے اور عالم شخص ہیں۔اگر عیسائیت میں خوبیاں نہ ہوتیں تو یہ اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت کیوں اختیار کرتے؟

ہندو مذہب کے عالموں نے اس بات کو رد کرتے ہوئے راجیش سے جوابی سوال کیا،

آپ نے ایسی کون سی بات عیسائیت میں دیکھی جو ہندومت سے افضل ہے اور ہندومت میں ایسی کون سی کمی ہے جو عیسائیت پورا کرتی ہے۔

راجیش نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔اس نے دل میں یہ بات محسوس کی کہ اسے تمام مذاہب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔تب کہیں جا کر ایسی بات کہنی چاہیے۔اس خیال کے پیش نظر اس نے مختلف مذاہب کی کتابوں اور تحریری مواد کو پڑھنا شروع کیا۔ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص اس کہہ رہا ہے،

تم قرآن کا ترجمہ کیوں نہیں پڑھتے؟

اس نے قرآن کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا اور ترجمہ میں غور و فکر بھی کرتا رہا۔اس کے ذہن میں جو بھی سوالات تھے ان کا جواب قرآن مجید میں موجود تھا۔بہت سی نئی نئی باتیں قرآن پاک پڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں آنے لگیں۔قرآن پاک کا اعجاز اس کے سامنے آیا تو دل اسلام کی طرف راغب ہوا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ان کا اسلامی نام عبدالعزیز رکھا گیا۔قبول اسلام کے بعد ڈاکٹر عبدالعزیز نے بھوپال میں سکونت اختیار کر لی اور ایک کمپنی میں ملازم ہوگئے۔ملازمت کے سلسلے میں انہیں اکثر اِندور جانا پڑتا تھا۔ایک بار کسی کام کے لئے انہیں اِندور سے اُلور جانا پڑا۔اُلور جاتے ہوئے راستہ میں ٹرین تبدیل کرنی پڑتی تھی اور یہ تبدیلی اجمیر شریف سے ہوتی تھی۔ڈاکٹر عبدالعزیز اجمیر شریف کے اسٹیشن پر اترے تو

www.ksars.org

معلوم ہوا کہ دوسری ٹرین آنے میں بہت دیر ہے۔ اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنا سامان وغیرہ کمرۂ انتظار میں رکھوا دیا اور اجمیر شریف کی سیر کرنے چلے گئے۔ سیر کرتے کرتے ان کے ذہن میں خیال آیا کہ اجمیر شریف آیا ہوں اور خواجہ غریب نوازؒ کے مزار پر حاضری نہ دوں، کیسی عجیب بات ہے۔ اس وقت ان کے ذہن میں نہ بچپن کے واقعات تھے اور نہ انگلستان میں دیکھے ہوئے خواب انہیں یاد تھے۔ صرف یہ خیال ان پر طاری ہو گیا کہ انہیں درگاہ شریف پر حاضر ہونا چاہئے۔

جیسے ہی وہ خواجہ غریب نوازؒ کے روضے میں داخل ہوئے ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی، ذہن تمام خیالات سے خالی ہو گیا۔ بے اختیار روضے کے کٹہرے پر سر رکھ دیا۔ گریہ وزاری اور رقت طاری ہو گئی اور بے خود ہو کر رہ گئے۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہی چھ سات سال کا بچہ راجیش ہے جو روتے روتے سو گیا ہے اور خواب میں خواجہ غریب نواز اس سے بات چیت کر رہے ہیں۔ راجیش (عبدالعزیز) ماہ و سال کا ایک طویل عرصہ گزار کر آج پھر اسی نقطہ پر پہنچ گئے تھے جسے وہ چھ سات سال کی عمر میں چھوڑ کر آئے تھے۔ انہوں نے چھ سال کی عمر میں روح میں اپنی نسبت کا مشاہدہ کیا تھا اور آج جسم، طویل مسافت طے کر کے اسی نقطہ پر روح کے ساتھ موجود تھا۔ تاکہ روح کے ساتھ آگے سفر کر سکے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز گھنٹوں بے خودی کی حالت میں کھڑے رہے جب ہوش میں آئے تو ٹرین کا وقت نکل چکا تھا۔ درگاہ سے باہر آتے ہوئے وہاں موجود خدام سے کہا، ہم کل پھر آئیں گے۔ دوسرے روز آئے اور اندر گئے تو پھر بے خودی کی حالت طاری ہو گئی اور گھنٹوں ہوش و خرد سے بیگانہ رہے۔ تیسرے دن آئے اور جب حاضری دے کر باہر آئے تو وہیں بیٹھ کر نوکری سے اپنا استعفیٰ لکھا اور کمپنی کو بھیج دیا۔ اپنا تمام سامان وغیرہ لوگوں میں تقسیم کر دیا اور خود خاموشی سے درگاہ کے اندر ایک حجرے میں داخل ہو کر معتکف ہو گئے۔ چالیس روز مسلسل معتکف رہے۔ چالیس روز گزرنے کے بعد عبدالعزیز نے مشاہدہ کی حالت میں دیکھا کہ ایک بزرگ آئے اور انہیں ساتھ لے کر ایک سیڑھی کے پاس پہنچے۔ سیڑھی کے پاس پہنچ کر بزرگ نے سہارا دے کر انہیں ایک زینہ اوپر چڑھا دیا۔ ایک دوسرے صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے زینے پر کھڑا کر دیا۔ اس طرح وہ بہت سے زینے عبور کرتے ہوئے ایک اونچی سطح پر پہنچے تو انہیں وہاں تحفہ کے

www.ksars.org

طور پر بہت سی چیزیں عنایت کی گئیں۔ڈاکٹر عبدالعزیز نے وہ تمام چیزیں لے لیں اور زینے کے ذریعے نیچے واپس آ گئے۔ نیچے پہنچے تو وہی بزرگ کھڑے ملے جنہوں نے پہلا زینہ چڑھایا تھا۔انہوں نے کہا،

لاؤ دیکھیں،تم کیا لائے ہو؟

ڈاکٹر عبدالعزیز نے تمام عطیات ان کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ بزرگ نے ان چیزوں میں سے چند اپنے ہاتھ میں اٹھالیں اور ڈاکٹر عبدالعزیز کو دیتے ہوئے کہا، باقی چیزیں میں نے اپنے پاس رکھ لی ہیں۔ابھی تمہارے اندر ان کو سنبھالنے کی طاقت نہیں ہے،وقت آنے پر تمہیں دے دی جائیں گی۔

داکٹر عبدالعزیز نے بزرگ کی دی ہوئی چیزوں کو دیکھا تو ان میں تھرمامیٹر، اسٹیتھواسکوپ اور دیگر آلاتِ طب موجود تھے۔

اسی رات کا ذکر ہے کہ درگاہ خواجہ غریب نواز کے متولی نثار احمد نے خواب میں دیکھا کہ وہ خواجہ غریب نواز کی خدمت میں حاضر ہیں۔خواجہ صاحب سخت ناراضی کے عالم میں ان سے کہہ رہے ہیں کہ تم کیسے متولی ہو۔تمہیں معلوم نہیں کہ فلاں حجرے میں ایک غریب مسافر چالیس دنوں سے بے دانہ و پانی پڑا ہے۔فوراً جاؤ اور اسے باہر نکال کر فلاں مکان میں ٹھہراؤ اور قیام وطعام کا بندوبست کرو۔وہ بہت اچھا ڈاکٹر ہے، سامان طب خرید کر اسے دو اور کہو کہ علاج معالجے کا کام شروع کرے۔

نثار احمد گھبرا کر بیدار ہو گئے۔اسی وقت بتائے ہوئے حجرے پر پہنچے اور دروازہ تڑوا کر اندر گئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر عبدالعزیز اندر بے ہوش پڑے ہوئے ہیں۔اٹھوا کر گھر لائے،دودھ اور پانی آہستہ آہستہ کر کے حلق سے نیچے اتارا۔کچھ دیر بعد ڈاکٹر عبدالعزیز کی آنکھیں کھل گئیں۔ایک دو روز میں ان کی کمزوری دور ہو گئی اور طبیعت بحال ہو گئی۔نثار احمد نے ڈاکٹری سے متعلق سامان ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا،

www.ksars.org

یہ سامان میں آپ کو خواجہ غریب نوازؒ کے حکم سے دے رہا ہوں۔ ان کا یہ بھی حکم ہے کہ آپ فلاں مکان میں رہ کر علاج معالجے کا کام شروع کریں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز نے سامان لیتے ہوئے کہا، خواجہ صاحبؒ کا حکم سر آنکھوں پر۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹر عبدالعزیز ایک بار پھر خواجہ غریب نواز کی خواب میں زیارت کر رہے تھے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا، عبدالعزیز ہم تمہارے معاملے کی نگرانی کر رہے ہیں لیکن یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ تمہارے لئے روحانی استاد کا انتخاب کریں کیونکہ راہِ سلوک استاد کے بغیر طے نہیں ہو سکتی۔ رات چار بجے مزار کی پائنتی کی جانب مولسری کے درخت کے پاس پہنچ جانا، شیخ سے ملاقات ہو جائے گی۔

ڈاکٹر عبدالعزیز نے نہایت ادب سے عرض کیا" حضور! میں انہیں کس طرح پہچانوں گا۔ ازراہِ کرم ان کا اسمِ گرامی اور پہچان بھی بتادیں۔ خواجہ صاحبؒ نے فرمایا، فکر نہ کرو، تم انہیں دیکھتے ہی پہچان لو گے۔

ڈاکٹر صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ وہ رات بھر نہیں سوئے اور چار بجے کا انتظار کرتے رہے۔ ٹھیک چار بجے مولسری کے درخت کے نیچے پہنچ گئے، دیکھا کہ ایک صاحب درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ روشنی میں آتے ہی انہیں پہچان لیا، یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو خواب میں زینے کی پہلی سیڑھی پر چڑھایا تھا اور واپسی پر عطیات کا معائنہ کر کے سامانِ طب ان کے حوالے کیا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو وہ صاحب مسکرا اٹھے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز نے دوڑ کر ان کا ہاتھ تھام لیا اور شاگردی اختیار کر لی۔

اس مقام سے ڈاکٹر عبدالعزیز کی زندگی کا اگلا دور شروع ہوا۔ خواجہ غریب نوازؒ کی روحانی نگرانی اور امداد انہیں ہمیشہ حاصل رہی۔ چھ سات برس کی عمر میں اس روحانی نسبت کا پہلا نظارہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبدالعزیز نوجوانی میں عشق مجازی سے آشنا ہوئے، طب کی تعلیم مکمل کی اور شادی کے بعد انگلستان میں سکونت اختیار کی لیکن جب خواجہ غریب نواز کی روحانی نسبت نے اپنا کام کیا تو ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی حالات نے انہیں اجمیر شریف پہنچا دیا اور یہاں سے آپ کے روحانی سفر کا آغاز

www.ksars.org

ہوا۔اس روحانی سفر میں وہ کن کن مراحل سے گزرے اور کون سے مدارج طے کئے یہ ڈاکٹر عبدالعزیزاوران کے روحانی سفر کے رہنماخواجہ غریب نواز کو ہی معلوم ہے،تاریخ میں اس کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

www.ksars.org

ابوالکلام آزاد

شہیدِ عشق

آفتاب جب چمکتا ہے تو باغ و چمن کو نہیں ڈھونڈتا کہ اپنی کرنوں کا انہیں نشیمن بنائے۔اس کا فیضان ضوبخش مبداٗفیض کی طرح فیض عام ہے۔ محل سرائے شاہی کے کنگروں کے طلائی کلس اگر اس کی ضوفشانی سے چمک اُٹھتے ہیں تو کیا جنگل کے خشک درختوں کی شاخوں پر سنہری رنگ نہیں چڑھ جاتا؟ میرا مقصد نظام شمسی کے مرکز سے نہیں بلکہ آفتابِ اسلام سے ہے۔جب اس کی تجلی کی لہریں اُٹھیں توانہوں نے پہلے تو جسم وخون اور قوم ومرزبوم کے قائم کئے ہوئے امتیازات کو خس وخاشاک کی طرح بہادیا۔پھر سیرابی کا وقت آیا تواحرارِ قریش اورار قائے حبش،بطحاویثرب اور عجم وفرنگ،تاجدارِ غسان اور بادیہ نشینانِ عرب،ادنی واعلیٰ،دورونزدیک سب کو یکساں طورپر شریکِ فیض کیا۔صرف صلاحیت اوراثرپذیری معیار فیض رسانی تھی کہ ہر قوم اور ہر زمین بقدرِ صلاحیت حصہ یاب ہوئی۔ابوجہل قریشی تھااور خزانے کے پاس، مگر مدت العمر محروم رہا۔بلالؓ حبشی اور سہیلؓ رومی تھے،پھر کس قدر دور مگران کے دامن دیکھئے تومالامال تھے۔ابرِکرم کہاں نہیں برستا، مگر ہر زمین لالہ زار نہیں بن جاتی۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

یہ اسی فیاضانہ فیض بخشی کا نتیجہ تھا کہ عرب گو مبداٗومنشائے اسلام تھا مگراس کی کوئی خصوصیت نہیں رہی۔مسلم قومیں جو دوردراز ملکوں سے آئی تھیں ہر علم وفن میں اس طرح دست بر علم ہوئیں کہ خود عرب کوان کے لئے اپنی صفیں توڑدینی پڑیں۔یہاں تک کہ آج تراجم ورجال کی کتابیں اُٹھاکر دیکھتے ہیں تو کوئی علم وفن ایسا نظر نہیں آتا جس پر نو مسلم قوموں کا

www.ksars.org

تسلط نہ ہو۔ حتیٰ کہ فقر و تصوف جس کی مذہب کے سائے میں پرورش ہوئی ہے اس کی تاریخ بھی نو مسلم اشخاص کی خود فروشیوں کی منت پذیری سے آزاد نہیں۔ بات یہ ہے کہ خدا کی محبت کی طرح اسلام کی بے دریغ فیض بخشی بھی اس طرح عام تھی کہ نسب و قومیت کے امتیازات کو اس میں دخل نہ تھا۔ زرّیں کلاہوں اور ریشمی قباؤں پر نظر نہیں پڑتی۔ سرچشمہ فیضانِ الٰہی بھی تشنگانِ محبت کو ڈھونڈتا ہے۔ نسب و قومیت اور رنگ و خاندان سے کیا سروکار؟

اس عام فیض بخشی کی نمایاں نظیر حضرت سرمدؒ کی سوانح عمری بھی ہے۔ وہ ایران کے کسی ارمنی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مذہباً یہودی یا مسیحی تھے۔ آغازِ عمر ہی میں فیضانِ الٰہی کی نظر انتخاب پڑی اور جذب ہدایت کی کشش نے مشرف بہ اسلام کیا۔

تحصیل علمی کا حال معلوم نہیں۔ لیکن تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ علم و فضل اور عربیت میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ تحصیل علمی اس زمانے کے نصاب کے مطابق کامل ہوگی۔

ابتدائی پیشہ تجارت تھا۔ ایران سے تجارتی اموال لے کر ہندوستان کی طرف بڑھے۔ اس زمانے میں ایرانی سیاح عموماً سندھ ہو کر ہندوستان آتے تھے۔ سندھ کے شہروں میں ٹھٹھہ ایک مشہور شہر تھا جس کو اب نئے جغرافیہ میں گمنامی کا خانہ نصیب ہوا ہے، یہی ٹھٹھہ وہ سینائے مقدس تھا جو سرمدؒ کے لئے تجلی گاہِ ایمن بنا اور لیلائے حُسن نے اول اول اپنے چہرے سے نقاب الٹی۔ کہتے ہیں کہ ایک ہندو لڑکا تھا جس کی چشم کافر نے یہ فسوں طرازی کی اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں کیوں کہ عشق خیز دلوں کو دونیم کرنے میں بخیہ گر کی سوئی اور جلاد کی تیغ دونوں برابر ہیں۔ یہاں تجارت میں خریدار عموماً بے پرواو بے نیاز مگر صاحبِ جنس غرض مند ہوتا ہے۔ پھر جو لوگ کہ اپنے دلوں کو ہاتھوں پر بطور نذر رکھے ہوئے خریدار ڈھونڈتے ہوں انہیں تو حق ہی نہیں کہ خریدار میں خاص اوصاف کے طالب ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سادہ لوح ایرانی تاجر بھی متاعِ دل کی کس مپُرسی سے تنگ آگیا تھا اور خود خریدار کو بے تابانہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ جب خریدار مل گیا تو نظر اُٹھا کر دیکھا تک نہیں کہ کون ہے اور کیا لے کر آیا ہے۔ اسی کو غنیمت سمجھا کہ دل جیسی متاع ارزاں کی، ایک چشم سحر کار طالب ہے اور بلا تامل یہ سودا منظور کرلیا۔

www.ksars.org

دلال عشق بود خریدار جانستاں
خودرا فروخیتم، چہ سودا بما رسید

سرمدؒ کو آئندہ جس صحرا میں بادیہ پیمائی کرنی تھی یہ اس کی طرف پہلا قدم تھا اور کچھ سرمدؒ ہی کی خصوصیت نہیں، عشق خواہ کسی عنوان ہو منزلِ حقیقت کا ہمیشہ سے پہلا قدم ہے، بلکہ یہ کہنا بھی تنزل ہے۔ منزلِ حقیقت کا کیا ذکر، عشق تو وہ دروازہ ہے جس سے گزرے بغیر انسان انسان نہیں ہو سکتا۔ جس کے دل و جگر میں ٹیس اور آنکھوں میں تری نہیں اس کو معنیِ انسانیت سے کیا واسطہ؟ تم نے اکثر دیکھا ہو گا کہ زاہدِ معتکف بھی بایں ہمہ تعبس و تقشف جب اپنے زادیہ، عبادت میں سر بہ زانو ہوتا ہے تو حور و غلمان کی مُسکراہٹ سے لطف لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یعنی جو خشک دماغ مسجد کے گوشوں اور ہجروں میں دوست ڈھونڈتے ہیں، انہیں بھی اس تصور کے بغیر چارہ نہیں۔

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہِ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

یہی وجہ ہے کہ جو سودازادگانِ حقیقت شاہدِ ازلی کے جاں دادہ ہیں انہیں بھی عشقِ مجازی کے کوچوں میں در و دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا گیا ہے۔ کیونکہ دل جب تک لذت آشنائے درد نہ ہو برف کا ایک ٹکڑا ہے جس کو پانی بنتے دیکھا گیا ہے مگر برف آگ میں جلتے ہوئے کبھی نظر نہ آئی۔ حالانکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے اور عشق کا کلیسا آتش کدہ ہے۔ یہاں وہی آتش طلب قدم رکھ سکتے ہیں جو اپنے دلوں کو اس آتش کدہ پر نذر چڑھادیں۔ اور پھر دامن سے ہوا بھی دیتے جائیں کہ کہیں شعلوں کی بھڑک کم نہ ہو جائے۔

افسردہ را نصیب نباشد دلِ کباب
آں یابد ایں نوالہ کہ مہمانِ آتش است

عشقِ الٰہی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ماسوا کی طرف سے آنکھیں بند کرلی جائیں۔ مگر انسان آب و گل کے تعلقات میں اس طرح پابہ گل ہے کہ جب تک دل پر کوئی محکم چوٹ نہ لگے ادھر سے ٹوٹ نہیں سکتا۔ مکھی جب شہد پر بیٹھ جاتی ہے تو جب تک اُڑائیے نہیں، نہیں اُڑتی۔ انسان کا دل بھی جب تک چوٹ نہ کھائے دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق ہی

www.ksars.org

کے ہاتھوں لگ سکتی ہے۔ عشق کا فرشتہ اپنے بازوؤں میں وہ مافوق الفطرت طاقت رکھتا ہے کہ اس کی تیغ کا پہلا ہی وار خون کے تاروں سے بندھے ہوئے رشتوں اور دنیا کی دل فریبیوں کی جکڑی ہوئی زنجیروں کے سو ٹکڑے کر دیتا ہے، اور دل جب ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو حلقۂ ازل کے سوا اور کوئی بیڑی پاؤں میں نہیں ہوتی۔ اسی درد کے لئے عارف عطار بے قرار نغاں ساز ہے کہ

کفر کافر را و دیں دیندار را

ذرۂ دردے دل عطار را

غور کرو جس مردہ دل کو کبھی یہ وقت خوش نصیب نہ ہوا کہ کسی بند نقاب کے ٹوٹنے کے تصور میں اپنے خرمن ہوش وحواس پر بجلیاں گرائے، اس کو شاہد حقیقت کا نظارہ حواس ظاہری سے کب کھو سکتا ہے؟ جس افسردہ ُتنفس نے اپنی عزیز اور شیریں باتیں کسی نرگسِ خواب آلود کی یاد میں نہ کاٹی ہوں، اس کو معشوق حقیقی کی یاد میں بے چین راتیں کب نصیب ہوں گی؟ جس خیرہ دماغ نے اپنے سرمایۂ عجز و نیاز کو کسی مغرور ناز کی کج ادائیوں اور بے نیازیوں پر نثار نہ کر دیا ہو وہ خود پسندی اور خود آرائی کے بُت کو کیوں کر توڑ سکتا ہے؟ جس بے حس کو کسی پیکر حُسن کی صدائے شیریں نے مبہوت اور لایعقل نہ کر دیا ہو، اس کو ساز ازلی کی نغمہ سرائی پر کیوں کر وجد آئے، غرض کہ جس بدنصیب کو کسی مست حُسن کی نگاہ بے محابا بے خود نہ کر سکی اُسے جلوۂ طور پر کیوں غش آنے لگا؟ جو فتیلہ پہلے جل چکا ہو وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے لیکن نئے فتیلے کو بہت دیر تک آگ دکھلانی پڑتی ہے۔

محبت در دلِ غم دیدہ الفت بیشتر گیرد

چراغے را کہ دودے ہست در سر زود درگیرد

نظریں اگر جویائے حُسن ہیں تو روئے پنہاں کے نظارے کی کیوں منتظر ہیں انہیں تو پردۂ نقاب کی زیبائی ہی پر لوٹ جانا چاہئے۔ کنعان کی گم کردہ پسر آنکھوں نے جلوۂ یوسفی کا انتظار نہیں کیا۔ پیراہن یوسفی کی بو پاتے ہی کھل گئیں کہ إِنِّي لأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلا أَنْ تُفَنِّدُونِ یہی وجہ ہے کہ میخانۂ حقیقت میں جب مجلس گرم ہوتی ہے تو پہلے جام و مینا کا دور چلتا ہے اور جب اس کے تلخ گھونٹ گوارا ہو جاتے ہیں تو پھر خود ساقی اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دیتا ہے کہ اب جام وسبو کی ضرورت نہیں۔ اس کی نگاہِ نشہ خیز سے خود رفتگی و خود گزشتگی حاصل کیجئے۔

www.ksars.org

مے حاجت نیست مستیم را

در چشم تو تا خمار باشد

سرمدؒ کے آگے بھی یہ جام رکھا گیا اور جام کی خوبی بہت کچھ جام پیش کرنے والے ہاتھ کی رعنائی پر منحصر ہے۔ اس لئے ہم اس ہندو لڑکے کو بھولنا نہیں چاہتے جس کی نگاہ لیلیٰ روش نے سرمدؒ کو مجنوں بنایا۔ مگر افسوس کہ ہر عاشق قیس و فرہاد کی قسمت کہاں سے لائے؟ سرمدؒ کے لیلیٰ کا زیادہ سے زیادہ حال جو معلوم ہوتا ہے یہی ہے کہ ایک ہندو لڑکا تھا اور غور کیجئے تو یہ بھی بہت ہے کیونکہ بازارِ عشق میں جب سودا چکایا جاتا ہے تو یہ کب دیکھا جاتا ہے کہ خریدار کون ہے اور کیا قیمت مل رہی ہے۔

مرا فروخت محبت ولے نمی دانم

کہ مشتری چہ کس ست و بہائے ما چندست

اربابِ تذکرہ اس میں بھی ہم آہنگ نہیں کہ یہ واقعہ کہاں ہوا۔ والہ داغستانی لکھتا ہے کہ بندر سورت میں اور آزاد بلگرامی نے اپنے کسی تذکرے میں عظیم آباد (پٹنہ) لکھا ہے۔ لیکن ان سب میں مراۃ الخیال قدیم العہد ہے۔ اور اس کا بیان ہے کہ ”دراثنائے تجارت بشہر تتہ افتاو برہندو پسرے عاشق گشت۔“ اس لئے ہم نے اس کو ترجیح دی ہے۔ بہر کیف بجلی کہیں گری ہو، دیکھنا یہ ہے کہ دہقان کے خرمن سوختہ کا کیا حال ہوا؟

عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں۔ ہر عاشق گو قیس نہ ہو مگر مجنوں ضرور ہوتا ہے اور جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے کہ میرے لئے جگہ خالی کرو۔ سرمدؒ پر یہی حالت طاری ہوئی اور جذب و جنون اس طرح چھایا کہ ہوش و حواس کے ساتھ تمام مال و متاعِ تجارت بھی غارت کر دیا۔ دنیاوی تعلقات میں سے جسم پوشی کی بیڑیاں باقی رہ گئی تھیں۔ بالآخر اس بوجھ سے بھی پاؤں ہلکا کیا کہ پابندیاں تو مدعیانِ ہوشیاری کے لئے ہیں۔ مجنونِ لایعقل مرغوع القلم ہوتے ہیں۔

خطا بمردم دیوانہ کس نمی گیرد

جنوں نداری و آشفتۂ خطا اینجا ست

www.ksars.org

بیاباں نوردی عالمِ عشق کی سیر وسیاحت ہے کہ اسی سے انسان کی عقل تجربہ کار وپختہ ہوتی ہے۔ ''مجنوں'' جو صف عشاق میں نمایاں نظر آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ صحرا گردی میں کوئی اس کا حریف نہیں۔ سرمدؒ نے بھی مدتوں صحرا کی خاک چھانی۔ سندھ کے ریگ زاروں سے تلوے گرم کئے، ہندوستان کے گرم وسرد موسموں کو یکساں عُریانی میں کاٹ دیا اور بالآخر جب یہ عقدہ کھلا کہ ۔

بے ہودہ چرا درپئے او می گردی
بنشیں! اگر او خدا ست خودمی آید
سرمدؒ

تو پھر ایک مستقر کی تلاش ہوئی جہاں بیٹھ کر عشق کے آخری امتحان کا انتظار کیا جائے۔ لیکن جب نتیجہ یہی تھا تو پھر یہ بیاباں نوردی کیوں تھی؟ مگر نہیں، خود کہہ چکا ہوں کہ یہ بھی عشق کے قانون کمال میں داخل ہے اور عشق کے قانون میں استثنا نہیں۔ ۔

یکے از دستگیری ہائے عشق است
عزیزاں را بخواری بر کشیدن

یہ وہ زمانہ تھا کہ عنقریب بساطِ ہند پر عالمگیر ایک نئی چال چلنے والے تھے اور شاہ جہانی حکومت کا عہد آخری اور شہزادہ داراشکوہ ولی عہدِ سلطنت تھا۔ سلسلہ مغلیہ میں داراشکوہ ایک عجیب طبیعت اور دماغ کا شخص گزرا ہے۔ اور ہمیشہ افسوس کرناچاہئے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا ہے۔ اس لئے اصل تصویر پولیٹیکل چالوں کے گرد وغبار میں چھپ گئی۔ وہ ابتدا سے درویش دوست اور صوفیانہ دل ودماغ کا شخص تھا اور وہ ہمیشہ فقرا اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی بعض تحریرات جو دست بُرد حوادث سے بچ گئی ہیں بتلاتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا بھی ذوق وکیفیت سے خالی نہیں، اس کے صاحب ذوق ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں دَیر وحرم کی تمیز اُٹھادی تھی اور جس نیاز کیشی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے سر جھکاتا تھا ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں سے بھی رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحب حال اختلاف کر سکتا ہے

www.ksars.org

کیونکہ اگراس عالم میں بھی کفرواسلام میں تمیز ہو تو پھر اعمٰی اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا؟پروانہ کو تو شمع ڈھونڈھنی چاہئے۔ اگر صرف شمع حرم ہی کا شیدا ہے تو سوز طلبی میں کامل نہیں۔

عاشق ہم از اسلام خرابست وہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

سرمدؒ جوش جنوں میں پھرتا ہوا جب شاہ جہاں آباد، دہلی پہنچا تو قضا نے اشارہ کیا کہ قدم روک لئے جائیں، کیونکہ جس جام کی تلاش ہے وہ اسی مے خانہ میں ملے گا۔مصنف مراۃ الخیال جو عالمگیر پرستی کے معبد میں صفِ اولین کا طالب ہے لکھتا ہے کہ ''چوں خاطر سلطان دارا شکوہ بجانب مجانین میل واشت صحبت بوے در گرفت''۔بے چارہ علی شیر بھی ہوشیاری و دیوانگی ہی کی بحث میں سر مار رہا ہے۔اسے کیا خبر کہ دنیا میں ایسے ترازو بھی ہیں جن کے ایک پلے میں اگر دیوانگی رکھ دی جائے تو دوسرا پلہ تمام عالم کی ہوشیاری رکھ دینے سے بھی نہیں جھک سکتا۔اور پھر ایسے خریدار بھی ہیں جن کو اگر ہوش وحواس کا تمام سرمایہ دے دینے سے ایک ذرّہ جنون مل سکتا ہو تو بازار یوسف کی طرح ہر طرف سے ہجوم کریں۔بہر کیف خواہ کچھ ہو، عالمگیر کی ہوشیاری سے تو ہمیں دارا شکوہ کی دیوانگی اور جنون دوستی پسند آتی ہے کہ وہاں تو تیغ ہوشیاری کشتگان حسرت کے خون سے رنگین ہے اور یہاں خود اپنے جسم کی رگ ہائے گردن سے خون کی نالیاں بہہ رہی ہیں۔

شاید دارا شکوہ بھی عالمگیر جیسے ہوشیاروں کی ہوشیاری سے تنگ آ گیا تھا اسی لئے اس نے مجانین کی صحبت کو ہوش والوں کی مجلس پر ترجیح دی۔

غرض کہ سرمد دارا شکوہ کی صحبت میں رہنے لگا اور اُسے بھی سرمدؒ سے کمال عقیدت تھی۔اسی زمانے میں عشق کی شورش انگیزیاں اسے کبھی کبھی باہر نکلنے پر مجبور کرتیں لیکن چونکہ معلوم ہو چکا تھا کہ آخری امتحان گاہ یہی ہے اس لئے شاہجہاں آباد سے نکل نہیں سکتا تھا۔یہاں تک کہ شاہجہاں کی علالت اور دارا شکوہ کی نیابت نے عالمگیری ارادوں کے ظہور کا سامان کر دیا۔اور ایک عرصہ کی شورش وخون ریزی کے بعد سن 1069ھ میں عالمگیر اورنگ زیب تخت نشین حکومت ہوا۔یہ زمانہ دارا شکوہ کے ساتھیوں اور ہم نشینوں کے لئے خود دارا شکوہ سے کم مصیبت انگیز نہ تھا۔بہت سے لوگ تو دارا شکوہ کے

www.ksars.org

ساتھ نکل گئے اور جو رہ گئے انہوں نے اپنے آپ کو کشتیِ طوفان میں پایا۔ لیکن اس رہینِ بے خبری کو اپنے استغراق میں اس کی فرصت کہاں ملتی تھی کہ دنیا کو نظر اٹھا کے دیکھے اور اگر دیکھتا بھی تو وہاں سے کیوں کر نکلتا۔ کیونکہ بایں ہمہ بے خبری اس سے بے خبر نہ تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے عشق کی ابتدائی منزلیں تھیں، آخری منزل طے کرنی باقی ہے اور وہ یہیں پیش آنے والی ہے۔

بیک دو زخم کہ خوردن زعشق امن مباش
کہ در کمیں گہے ابرو کمان کش ست ہنوز

سرمدؒ کی شہادت کے اسباب تذکرہ نویسوں نے مختلف بتلائے ہیں۔ تذکرۃ الخیال میں ہے کہ سرمدؒ کی اس رباعی پر جُبہ پوشان شرع کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے اسے کفر قرار دیا کہ معراج جسمانی سے انکار لازم آتا ہے۔

ہر کس کہ سر حقیقتش پادر شد
او پہن تر از سپہر پہنا در شد
مُلا گوید کہ بر فلک شد احمدؐ
سرؔمد گوید فلک بہ احمدؐ در شد

مگر اس تِرکِ سادہ کو فقیہانہ جنگ وجدل سے کیا سروکار تھا۔ اس نے نظر اُٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ یہ کور بصر کیا شور و غوغا کر رہے ہیں۔ وہ تو اس عالم میں تھا جہاں اقرار و انکار کی بحثوں کی آواز بھی نہیں پہنچ سکتی۔

در عجائب ہائے طورِ عشق حکمت ہا کم است
عقل را با مصلحت اندیشی مجنوں چہ کار

لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ عالمگیر کی نظروں میں تو سرمدؒ کا سب سے بڑا جُرم دارا شکوہ کی معیت تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خوں ریزیاں جو پلیٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں انہیں مذہب ہی کی چادر اوڑھا کر چھپایا گیا ہے۔ جب کوئی اور بہانہ نہ ملا تو عُریانی اور برہنگی کو کہ خلاف

www.ksars.org

رسمِ شرع ہے بنیاد قرار دیا اور مذکورہ بالا رباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراجِ جسمانی کا منکر ہے۔ مُلا قوی اس زمانے میں قاضی القضاۃ تھے۔ عالمگیر نے انہیں سرمدؒ کے پاس بھیجا کہ برہنگی کی وجہ دریافت کریں۔ مُلا صاحب نے کہا باوجود کمال علم و فضل برہنہ اور مکشوف العورۃ رہنا کس عذر پر مبنی ہے؟ سرمدؒ نے کہا کیا کروں شیطان قوی ہے اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی۔

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا
چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
اور در بغل من است و من در طلبش
دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

مُلا صاحب برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات ہی تھی کہ اسلام کی توہین نہیں کی گئی مگر خود ان کے وجود اسلام عبارت کی سخت اہانت ہوئی یعنی ان کا اسم سامی ابلیسِ لعین کا وصف قرار پایا۔ بہر کیف انہوں نے عالمگیر سے آکر کہا کہ کفر کا کافی مواد ہاتھ آگیا ہے اور قلم دان کھولنا چاہا کہ علمائے ظاہر کی تیغ خوں آشام اسی نیام میں رہتی ہے لیکن عالمگیر کی عاقبت اندیشیوں نے صرف اس بہانے کو کافی نہیں سمجھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ سرمدؒ کوئی معمولی شخص نہیں ہے جس کا قتل ایک عامۃ الورود واقعہ سمجھا جائے گا۔ علم و فضل کے لحاظ سے کوئی اس کا ہمتا نہیں اور رجوع خلائق کا یہ حال ہے کہ سارا شاہجہاں آباد اس کا معتقد اور ہوا خواہ ہے۔ اس لئے جب تک کوئی بہانہ قوی ہاتھ نہ آئے، اس ارادے کو ملتوی رکھنا چاہئے۔

اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصے میں فقہا کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا ہے اور ہزاروں حق پرستوں کا خون ان فتوؤں کا دامن گیر ہے۔ اسلام کی تاریخ کو خواہ کہیں سے پڑھو، سینکڑوں مثالیں کہتی ہیں کہ بادشاہ جب خوں ریزی پر آتا ہے تو دارالافتاء کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے۔ صوفیہ اور ارباب وطن پر منحصر نہیں، علمائے شریعت میں سے بھی جو نکتہ بیں، اسرار حقیقت کے قریب ہوئے فقہا کے ہاتھوں انہیں مصیبتیں اُٹھانی پڑیں اور بالآخر سر دے کر نجات پائی۔ سرمدؒ بھی اسی تیغ کا شہید ہے۔

www.ksars.org

چوں می رود نظیریؔ خونیں کفن بہ حشر

خلقے فغاں کنند کہ ایں داد خواہِ کیست

آخرُالامر یہ قرار پایا کہ سرمدؒ کو علماء وفضلائے عصر کے مجمع میں طلب کیا جائے اور تمام علما کی جو رائے قائم ہو اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ مجلس منعقد ہوئی اور سرمدؒ کو بلایا گیا۔ سب سے پہلے خود عالمگیر مخاطب ہوا اور پوچھا، لوگ کہتے ہیں کہ سرمد نے دارا شکوہ کو مژدۂ سلطنت دیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟ سرمدؒ نے کہا ہاں، وہ مژدہ درست نکلا کہ اُسے ابدی سلطنت کی تاج پوشی نصیب ہوئی۔ عمامہ بندوں نے کہا برہنگی شرع کے خلاف ہے اور اس کے لئے صاحبِ عقل و تمیز کا کوئی عذر مسموع نہیں۔ اس کا جواب تو سرمدؒ پہلے ہی دے چکا تھا۔

دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

خلیفہ ابراہیم بدخشانی، عہدِ عالمگیری میں ایک صاحبِ طریقت بزرگ گزرے ہیں جو ابتدائے جوانی میں سپاہی پیشہ تھے اور فتح اللہ خاں کے ہاں کہ امرائے عالم گیری میں سے تھا، نوکر ہو گئے تھے۔ اتفاقاً میر جلال الدین بدخشانی نامی ایک صاحبِ حال بزرگ کی ان پر نظر پڑ گئی اور ان کو فیض پذیر دیکھ کر اپنی تربیت میں لے لیا۔ رفتہ رفتہ یہ خود بھی صاحبِ حال ہو گئے۔ علم ظاہری کی تحصیل کا گو موقع نہ ملا لیکن مذاق فطری کا یہ عالم تھا کہ مثنوی معنوی کا دفتر ہفتم چار حصوں میں نظم کیا جو دردِ و کیفیت سے لبریز ہے، معزالدین جہاندار شاہ کو ان کی خدمت میں کمال اعتقاد تھا اور ہندوستان و دکن میں ہزاروں اشخاص ان کے معتقد حلقہ بگوش تھے۔

والہ داغستانی انہیں بزرگ سے روایت کرتا ہے کہ جب مجمع علما میں سرمد کو لباس پہننے کے لئے کہا اور مسموع نہ ہوا تو بادشاہ نے علما سے کہا کہ محض برہنگی وجہ قتل نہیں ہو سکتی۔ اس سے کہا جائے کہ کلمہ طیبہ پڑھیئے۔ اور یہ اس لئے کہا کہ بادشاہ سُن چکا تھا کہ سرمد کی عادات عجیبیہ میں سے ایک یہ عادت بھی ہے کہ کلمہ طیبہ جب پڑھتا ہے تو لاالٰہ سے زیادہ نہیں کہتا۔ علما نے سرمدؒ سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے بموجب صرف لاالٰہ پڑھا کہ جملہ نفی ہے۔ اس پر علما نے شور مچایا تو کہا ”ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں۔ مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا۔ اگر الااللہ کہوں گا تو جھوٹ ہو گا اور جو دل میں نہ ہو تو زبان پر کیسے آئے؟“

www.ksars.org

علمانے کہاایسا کہنا کفرِ صریح ہے۔ اگر توبہ نہ کرے تو مستحق قتل ہے۔ یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمدؒ اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر وایمان کی بحثیں سنائی جائیں اور وہ قتل وخون کے احکام سے مرعوب ہو۔ کفر ساز تو اپنے مدرسہ اور مسجد کے صحن میں کھڑے سوچتے تھے کہ اس کی کرسی اتنی اونچی ہے اور وہ اس منارۂ عشق پر تھا جہاں کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں اور جہاں کفر وایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں۔

کشورے هست که دروے رود از کفر سخن

همه جا گفت و شنو بر سر ایمان نه رود

اور سرمدؒ نے اپنی اصلی حالت بے کم وکاست بیان کر دی تھی۔ ایمان بالغیب پر جو لوگ قانع نہیں ہوتے (اور اس عدم قناعت ہی کا نام تلاشِ حقیقت ہے) وہ اپنے اقرار کو مشاہدہ عینی سے استوار کرنا چاہتے ہیں اور شاہد حقیقت کی رونمائی نقد شہادت ہے جو ابھی سرمدؒ کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پس جس چیز کو دیکھا نہیں تھا کس طرح کہہ دیتا کہ ہے اس ملک کے جتنے رہرو ہیں سب ہی کو اس منزل سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن سرمدؒ کا جرم یہ تھا کہ وہ جس جام کو چھپ کر پیتے ہیں سرمدؒ نے اعلانیہ اسے منہ سے لگایا اور درہ محتسب کا مستحق ٹھہرا۔

خرقه پوشاں همه گر مست گزشتند گزشت

قصهٔ ماست که در کوچه و بازار بماند

اور نظرِ تعمق سے دیکھئے تو یہ اعلان ضروری تھا کیونکہ جب اس سفر کی آخری منزل شہادت تھی تو خواہ ناقے کا رُخ کسی طرف ہوتا، دست کار فرما کا فرض تھا کہ اسی طرف پھیر دے۔

منصور را که رخصت اظهار داده اند

غیر از قصاص ومحنت زنداں نبوده شرط

www.ksars.org

غرض کہ جب سرمدؒ نے توبہ نہ کی تو علما نے بلاتامل فتوائے قتل صادر کیا اور دوسرے دن قتل گاہ میں لے گئے۔ بموجب بیانِ مراۃالخیال یہ واقعہ ۱۰۷۲ھ میں ہوا کہ عالمگیر کی تخت نشینی کو تین سال سے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا۔

موبہ مویم دوست شد ترسم کہ استیلائے عشق
یک انا الحق گوئے دیگر برسردار آوردد

شاہ اسد اللہ نامی ایک مرد درویش و حق آگاہ راوی ہیں کہ مجھے سرمدؒ کی خدمت میں کمال خصوصیت حاصل تھی۔ جب شورش و ہنگامہ شروع ہوا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک دن موقع پاکر عرض کیا کہ اگر اپنی وضع و حالت بدل دیں تو بندگانِ الٰہی کی منت و سماجت دیکھتے ہوئے بظاہر کوئی نقصان نہیں، یہ سُن کر نظر اُٹھائی اور اپنا یہ شعر پڑھ دیا۔

عمریست کہ آوازۂ منصور کُہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

جب سرمدؒ کو شہادت گاہ لے چلے تو بیان کیا جاتا ہے کہ تمام شہر ٹوٹ پڑا تھا اور اِس قدر ہجوم تھا کہ راہ چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ عشق کی نیرنگیوں کو کیا کہئے جہاں کا عام پسند تماشہ خوں ریزی ہے، جہاں قربانی سے بڑھ کر کوئی دل پسند کھیل نہیں۔ جب کوئی سردادہ سربکف بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے دولھا کی سواری جارہی ہے اور براتیوں کا ہجوم ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔

بجرمِ عشق توام می کشند و غوغائے ست
تو نیز برسرِ بام آ کہ خوش تماشائے ست

مگر یہ عشق مجازی تھا کہ سرِبام آنے کی خواہش کی گئی ورنہ سرمدؒ کو سر اُٹھانے کی بھی ضرورت نہ ہوئی جب جلاد تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا تو مسکرا کے نظر ملائی اور کہا،

”فدائے توشوم، بیا بیا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی ،من ترا خوب می شناسم“

www.ksars.org

صاحبِ مراۃ لخیال راوی ہے کہ اس جملے کے کہنے کے بعد یہ شعر پڑھا اور مردانہ وار تلوار کے نیچے سر رکھ کر جان دے دی۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ غنودیم

صاحبِ مراۃ الخیال کو عالمگیر کی خوشامد سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ سرمدؒ کی نعشِ خون آلود پر اشک افشانی کرتا۔ لیکن ستم یہ ہے کہ اس سنگ دلی پر قانع نہ ہو کر چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ خوں ریزی بھی عالمگیر کے دفتر مناقب و فضائل میں جگہ پائے۔ حالانکہ اس دفتر میں تو پہلے ہی ہر صفحہ رنگین ہے۔ اس کو بھی عشق کی شیوہ گری سمجھئے کہ یہاں کی قربانیوں سے جن کے ہاتھ خون آلود ہوتے ہیں وہ مجرم و خونی ہونے کی جگہ تحسین اور ثواب کا صلہ مانگتے ہیں۔ گویا میدانِ عشق بھی قربان گاہ منٰی ہے کہ جس قدر خون بہائے ثواب ہے۔

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمدؒ کی جہاں قبر سمجھی جاتی ہے یہ اس کا مدفن نہیں صرف مشہد ہے۔ لیکن والہ داغستانی نے تصریح کردی ہے کہ "در جنب مسجد جامع گردنِ اورازدند و در ہماں جا دفن کروند۔" یہ مقام موجودہ مقامِ مزار کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے؟ پھر لکھتے ہیں کہ "راقمِ حروف بزیارت مزار وے مکرر مشرف است۔ در چہار فصل سبزہ از تربتش کم نہ می شود۔ والحق فیض عجیے زیارتِ آں منصور ثانی ہست"۔ والہ داغستانی عہدِ محمد شاہی میں تھا اور اس کے تذکرے کا سالِ تصنیف ۱۱۶۰ھ ہے۔ لیکن آج بھی شہید سرمدؒ زیارت گاہِ عوام و خواص ہے اور ہمیشہ فاتح کے ہاتھ اس کے آگے روبہ آسمان رہتے ہیں۔

بر سرِ تربت حافظ چوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

www.ksars.org

خلیفہ ابراہیم جن کے حالات اوپر گزر چکے ہیں راوی ہیں کہ سرمدؒ نے زندگی میں کلمہ طیبہ لاالٰہ سے زیادہ نہیں پڑھا۔ لیکن جب شہادت پائی تو لوگوں نے سنا کہ سرِ گشتہ سے تین بار الا اللہ کی صدا بلند ہوئی۔ اس کے علاوہ والہ داغستانی لکھتے ہیں کہ ایک ثقہ جماعت سے سنا گیا ہے کہ سرمدؒ کا سرِ مقتول کلمہ طیبہ پڑھتا رہا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ دیر مصروفِ حمدِ الٰہی بھی رہا۔ موجودہ زمانے میں ایسی روایتوں پر لوگ بمشکل یقین لائیں گے اور سوانح نگار کا فرض ہے کہ خوش اعتقادی کی روایات اور تاریخ کو الگ الگ رکھے۔ لیکن ہمیں تو یہ بیان پڑھ کر کچھ بھی تعجب نہ ہوا کیوں کہ اگر خوش اعتقادی کے کان نہیں تو کیا حقیقت بینی کی آنکھوں سے بھی محروم ہونا چاہیئے۔ ہم نے بہار میں شگفتہ و شاداب پھولوں اور خزاں میں افسردہ اور خشک شاخوں کو باتیں کرتے دیکھا ہے۔ پھر اگر ایک شہیدِ عشق کے سرِ مقتول کے لب ہلتے نظر آئیں تو کیوں تعجب ہو۔ ممکن ہے کہ سرمدؒ کے بے جان سر سے آواز نکلی، مگر اربابِ بصیرت نے اس کی زبانِ حال کو تو ضرور متکلم دیکھا ہو گا اور ڈھائی سو برس سے زیادہ گزر گئے، ہمارے کانوں میں تو اب تک مشہدِ سرمدؒ سے صدا آرہی ہے کہ۔

کس چہ داند قدر مردن ہائے عشق
منت ایں مرگ برجانِ من است

عالمگیر ۱۰۶۹ھ میں تخت نشین ہوا اور تین سال کے بعد سرمدؒ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور اس کے بعد ایک قرن سے زیادہ عرصے تک حکومت کی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ۔

خونے کہ عشق ریزد ہر گز ہذر نہ باشد

یہ سرمدؒ کے خون ہی کی نیرنگیاں تھیں کہ اس تمام مدت میں عالمگیر کو کبھی راحت و اطمینان کے دن نصیب نہ ہوئے یہاں تک کہ پیغامِ اجل بھی آیا تو عالمِ غربت و پریشانی میں۔ مگر سوانح نگار کے قلم سے ایسے جملے نہیں نکل سکتے۔ ہمارے لئے تو یہی بہتر ہے کہ ہو سکے تو عالمگیر کو بھی اس معاملے میں معذور سمجھیں۔ تاریخ قیاس و ظنون اور شخصی آراء کے پریشان مجموعے کا نام ہے۔ آج چند میلوں کے فاصلے پر ایک حادثہ گزرتا ہے تو اخباروں کے دو نامہ نگار متفق البیان نہیں ہوتے۔ کس کو معلوم ہے کہ اس وقت کی اصلی حالت کیا تھی اور عالم گیر کے گرد و پیش کن حالات و اسباب کا ہجوم تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ خون رفتگانِ عشق جب اپنے قاتلوں سے گلہ مند جفا نہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ ان کی شکایت سے قلم آلودہ ہوں۔

www.ksars.org

جب سرمدؒ نے جلاد سے کہا کہ۔ ’’تو بہر صورتے کہ می آئی، من ترا خوب می شناسم۔‘‘ تو اسے ان عالمگیری علما سے کیا شکایت ہو گی! بات یہ کہ دیارِ محبت میں انتقام و دعوے کی شنوائی نہیں اور عشق کے مذہب میں کینہ و عداوت سے بڑھ کر کوئی شے حرام نہیں۔ یہاں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لے کر آئے تو سر جھکا دیجئے اور ہو سکے تو اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیجئے۔

شد است سینہ ظہوری پر از محبتِ یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

سرمد کے کلام کا ایک صحیح اور قلمی نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے مگر اس وقت پیشِ نظر نہیں۔ چند سطروں کا ارادہ تھا مگر کئی صفحے ہو گئے اور عشق کی حکایت ختم ہونے والی ہے۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ روحِ سرمدؒ پر دستِ فاتحہ اُٹھا کر خاموش ہو جاؤں۔ افسوس ہے کہ یہ داستان مختصر نہ ہو سکی مگر شہیدانِ محبت کی یاد میں جتنی دیر افسردہ رہ سکے بہتر ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرفِ عصا گفت موسیٰ اندر طور

www.ksars.org

عابد محمود

رقصِ ہجراں

سرمدؔ غمِ عشق بوالہوس را نہ دہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند

تمنائے وصلِ یاراور عاشق کی دیوانگی میں نہ جانے قدرت کے کون سے راز پنہاں ہیں کہ عارفوں نے عشق کو امام بنایا۔

دعا کرو کہ محبوب مل جائے۔

عامر نے سسکتے ہوئے کہا۔

میں خاموش رہا۔ بھلا میری کیا مجال تھی جو عشق کے معاملات میں دخل دیتا البتہ دوست کی آنکھوں میں موجزن ہجر کے سمندر نے میرے اندر گداز پیدا کر دیا۔

وہ میرے ہاتھ پکڑ کر التجائیہ لہجے میں بولا، تم دعا کرو کہ حاضری ہو جائے۔

میں نے آہ بھرتے ہوئے کہا، دل کی پوچھو تو میں چاہتا ہوں کہ محبوب کے در پر تمہاری حاضری کبھی نہ ہو — تمہارا سوز و گداز سدا قائم رہے۔

عامر نے شکوہ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میں نے یہ سوچ کر آنکھیں موند لیں کہ وہ ان آنکھوں میں اُس عکس کو نہ دیکھ لے جسے میں خود سے بھی چھپا کر رکھتا ہوں۔

وصل کس کو کہتے ہیں؟

www.ksars.org

حاضری کی تمنا کیا ہے؟

محب کو محبوب سے زیادہ قریب کون کرتا ہے؟

وصل یا فراق — ؟

محبوب سے چند ساعتوں کا قرب اہم ہے یا ہر گھڑی محسوس کرنا کہ زندگی محب کی ہو اور بسر محبوب کرے؟

یہ سوز اور درد ہی ہے جو اُس بندھن میں پرو دیتا ہے جس میں جدائی نہیں۔ دردِ دل اور سوزِ دروں محض چند حرفی الفاظ ہیں۔ ان لفظوں کی کیفیت جس قلب پر وارد ہوتی ہے، وہی بتا سکتا ہے کہ درد کیا ہے اور سوزِ دروں کیا۔

"ماہنامہ قلندر شعور" جون 2022ء کا سرورق دیکھ کر ایسا لگا کہ عشق کی تمثیل تصویر میں پیش کی گئی ہے۔ گداز بھرے دل سے دیر تک دیکھتا رہا کہ پروانے کیسے دیوانہ وار چراغ پر نثار ہو رہے تھے۔ کتنے ہی جل کر روشنی پر قربان ہو چکے تھے، کچھ اس مرحلے سے گزر رہے تھے اور کتنے ہی جلنے کو تیار تھے۔ اس لمحے دل پر نہ جانے کیا انکشاف ہوا کہ آنکھوں کے کنارے درد کی لہر سے تر ہو گئے۔ اک ہوک سی اٹھی جس نے خون میں شامل ہو کر جسم کو خبر کر دی۔

سرمد غمِ عشق بوالہوس را نہ دہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند

رباعی نے دل کے تار چھیڑ کر وہ سُر اور راگ پیدا کیے کہ میں پروانہ بن کر دیوانہ وار شمع کی جانب بڑھا مگر جل کر راکھ نہیں ہوا اور نہ دھواں اٹھا کہ میرے لئے یہی حکم تھا۔

نظر چراغ کے دائیں بائیں فنا ہونے والے پروانوں پر تھی۔ ذہن میں تکرار ہونے لگی کہ

پروانے جل کر راکھ کیوں ہوئے؟

www.ksars.org

روشنی سے مل کر روشنی کیوں نہیں بنے؟
چراغ بن کر کیوں نہ جلے؟

رات کے کسی پہر موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے نیم بیداری میں فون اٹھایا اور بولا،

السلام علیکم!

دوسری طرف خاموشی تھی۔

ہیلو! کون ہے؟

دور سے سسکیاں سنائی دیں۔ موبائل فون کی اسکرین پر نام دیکھا تو گہرا سانس لیا اور فون دوبارہ کان سے لگا کر خاموشی سے عامر کا درد سنتا رہا، وہ سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔ میں نے کچھ نہ کہا——اس کو رونے دیا۔ کیا کہتا——؟ میں محرمِ راز تھا۔

رسمی طور پر پوچھا، کیا بات ہے؟ کیوں جاگ رہے ہو، سوتے کیوں نہیں؟

وہ بولا، نیند کہاں ہے؟

جواب سن کر دل پر ضرب لگی۔

محب اپنے محبوب کا ذکر سننا چاہتا ہے اور جب کوئی محرم مل جائے تو سوزِ دل زبان سے بیان ہوتا ہے۔ عامر ان لمحوں کے حصار میں تھا جب اس کی ملاقات محبوب سے ہوئی تھی۔ میں اس کی باتیں ہوں ہاں کر کے سنتا رہا۔ بیچ میں ایک دو بول تسلی کے بول لیتا لیکن بقول شاعر،

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

www.ksars.org

عامر کا بھرم اس کی وضع قطع نے رکھا تھا۔ دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ کیسا درد، دل میں بسائے بیٹھا ہے۔ جب افسردگی بڑھ جاتی تو وہ حالِ دل سنانے میرے پاس آجاتا۔ ایک طرح سے وہ اپنے عشق کی آزمائش اور میرا امتحان بھی تھا۔ میرا امتحان کیسے؟ یہ آپ کو مضمون پڑھ کر علم ہوگا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ محبوب کے ذکر پر جب خوشی کے لمحات محیط ہونے لگتے تو وہ زخم کرید نا شروع کر دیتا اور پروانے کی طرح آتشِ سوزاں تلاش کرتا تھا کہ جل سکے۔

مجھے لگا کہ عاشق وصل سے زیادہ فراق کو یاد کرتا ہے کہ فراق کے لمحات اسے وصل کے لئے مضطرب رکھتے ہیں۔ وہ یادوں کے نام پر دکھ درد کی درجنوں لکڑیاں اکٹھی کرتا ہے اور ان سے اپنی چِتا بنا کر اس کو آگ لگا دیتا ہے۔

میں نے پوچھا، جب محبوب تمہارا ہے اور وہ بھی تمہاری محبت کا دم بھرتا ہے پھر کس بات کا دکھ ہے، دل کیوں جلاتے ہو؟ ان لمحات کی چاشنی کو محسوس کرو جو قدرت نے نصیب میں لکھے۔ لوگ تو ایک جھلک کی خاطر عمریں گزار دیتے ہیں۔ یہ کیسا عشق ہے جس میں شکوہ ہے، بے صبری ہے۔

عمرے باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

اگر نصیب میں وصل کے لمحات نہ لکھے ہوتے تو تم کیا کر سکتے تھے —؟ تمہارے پاس اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے اتنا کچھ ہے کہ راتیں سجدے میں گزار دو — حق ادا نہ ہوگا۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی تھی۔ میں سمجھا کہ لائن کٹ گئی ہے۔ موبائل اسکرین کی جانب دیکھا تو رابطہ منقطع نہیں ہوا تھا۔

عامر نے مجھ سے کہا، تم سب کو خوش رہنے کی تلقین کرتے ہو اور خود بھی بھنورے کی طرح خوش رہتے ہو۔ پروانے کے دل کا سوز تم کیا جانو؟ جدائی کا ایک ایک لمحہ صدیوں طویل ہے جب کہ وصل کے لمحے اس قدر قلیل ہیں کہ ان کا آنا جانا ایک لگتا ہے۔ سانسیں اکھڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور دل پھٹنے لگتا ہے۔ ہجر کی ساعتیں عذاب ہیں۔

www.ksars.org

یہ کہااور لائن کٹ گئی۔

———————

عامر سمجھتا تھا کہ میں ہجر سے ناآشنا ہوں۔

بھنورا ہوں جسے پروانے کے سوز کی خبر نہیں۔

سوچنے لگا کہ میں کون ہوں؟

میں پروانہ نہیں ہوں—— پھر میں کون ہوں؟

عامر کی بات درست لگی کہ میں بھنورا ہوں۔

———————

اب میری روداد پڑھیے۔

جب کبھی مرشد سے ملاقات ہوتی، آنسوؤں کی نذر ہو جاتی۔ سر جھکائے خود کو چھپاتا رہتا۔ ہجر کا دکھ میرے اندر بھی ہے جو اپنا اظہار چاہتا ہے لیکن میں اسے تھپکیاں دے کر سلا دیتا ہوں۔ اک بے کلی ہے جو نہ جانے مجھے کہاں کہاں پہنچا دیتی ہے۔ کوئی پل ایسا نہیں کہ چین نصیب ہو۔ کسی کو بتا نہیں سکتا کہ محبت مجھے بھی ہے اور وصل کی آرزو میں شمع کی طرح بہہ رہا ہوں۔

میں مثلِ پروانہ مرشد کے آستانے پر جلنے جاتا تھا لیکن ایک حجاب تھا جو الفاظ کو زبان پر آنے سے روک دیتا تھا۔ کچھ کہے بغیر، حالِ دل سنائے بغیر آستانے سے تشنگی کو دو آتشہ بنا کر رخصت ہو جاتا۔ ہمیشہ کی طرح ضبط کے ان مراحل سے گزرتا جہاں آنسو آنکھوں کے رستے باہر نہیں آتے—— اندر بہہ جاتے ہیں۔

www.ksars.org

ایک دن رم جھم رم جھم ایسی برسات ہوئی کہ ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ جب آنسو گرتے ہیں تو کیا محبوب خوش ہوتا ہے؟ جواب فوراً مل گیا۔ مجھے تکلیف میں دیکھ کر ان کے چہرے پر بھی تکلیف کی لہریں تھیں۔

انہوں نے فرمایا— خوش رہا کرو۔

ایسا لگا کہ میں نے انہیں دکھ دے دیا ہے۔ عشق کے رموز فہم سے باہر ہیں— عشق نے سمجھایا کہ تمہیں خوش رہنا ہے۔ اور میں نے اپنا حال کسی پر ظاہر کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ میں بھنورا ہوں یا کچھ اور، نہیں جانتا۔ بھنورے کا کام چمن کی خوب صورتی کو نہارنا ہے، ہر کلی، ہر پھول یہاں تک کہ ہر کانٹے میں محبوب کو دیکھ کر اس کے گرد دیوانہ وار رقص کرنا ہے۔

چمن میں وہ ہے تو پھر پھولوں میں کون ہے؟
پھولوں میں وہ ہے تو خوش بو میں کون ہے؟
خوش بو میں وہ ہے تو نزاکت کس کی ہے؟
نزاکت میں وہ ہے تو رنگوں میں کون ہے؟
بدلتے رنگوں میں وہ ہے تو چمن میں کون ہے؟

بھنورا چمن چمن گھومتا ہے— مجاز کی بھول بھلیوں سے آزاد شے میں یک رنگی دیکھتا ہے اور محبوب کو خود سے دور نہیں سمجھتا۔

حکماً تو کسی کا گنگنانا بھی نہیں جائز۔۔ یہ بھنورا کیوں بھلا پھر چپ نہیں رہتا

میں وہ بھنورا ہوں جسے اپنے ہونے نہ ہونے کی خبر نہیں۔ محبوب کی نظرِ عنایت جس چمن میں لے جاتی ہے، میں وہاں خود کو موجود پاتا ہوں۔

www.ksars.org

عامر ٹھیک کہتا ہے کہ ہجر کا عذاب تم کیا جانو۔ میں نے کبھی اس پر حال ظاہر نہیں کیا۔ میرے جذبات محبوب کی امانت ہیں، ان کی خبر کسی کو کیوں ہو؟ جب سے خوش رہنے کا حکم ملا ہے، میں وصل کے لمحات میں زندہ رہتا ہوں، پروانے کے دل کا سوز کیا جانوں! یہ سوچتے ہوئے میں زار و قطار رو پڑا۔ جب میں تھک جاتا ہوں تو محبوب کا تصور آغوش میں لے کر لوری سناتا ہے — ایسی میٹھی نیند پر ہزاروں رت جگے قربان!

ہر حال میں بس پیش نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

اندر میں گم فراق اور وصل کے معانی تلاش کر رہا تھا۔ ''ماہنامہ قلندر شعور'' کا سرورق ہنوز سامنے تھا جس میں چراغ کی لو کے گرد پروانوں کا رقصِ بسمل جاری تھا کہ نظر چراغ پر ٹھہری۔

خیال آیا کہ — پروانے تو پروانے، چراغ بھی جل رہا ہے۔ غور سے دیکھا تو اس کے دھاگے پر آگ لگی تھی۔ دھاگا جو اس کی لائف اسٹریم ہے، اس قدر خاموشی سے جل رہا تھا کہ کوئی اس پر نوحہ کناں نہیں۔ یہ کون ہے اتنا باظرف کہ جلتا رہے اور حرفِ شکایت بھی لب پر نہ ہو؟ دونوں جل رہے تھے مگر ایک خاموشی سے جب کہ دوسرے کی بے قراری کے دنیا میں چرچے تھے۔ ایک کی زندگی جل کر روشن ہو رہی تھی جب کہ دوسرے کی بجھ رہی تھی۔ ایک سے قرب کی چند ساعتیں برداشت نہیں ہوتیں جب کہ دوسرا جلتا رہتا ہے۔

آگہی کے لمحات نے منکشف کیا کہ چراغ بھی خود سے نہیں جلتا۔ تیل کے جلنے سے جلتا ہے۔ آخر تیل کیا ہے؟ تیل میں کیسی کشش ہے کہ ہر پروانہ نثار ہونے کی تمنا رکھتا ہے؟ یہ کیسی کشش ہے جو پروانے کو فنا کر دیتی ہے مگر خود کو چھپانے کے لئے روشن پردے میں رہتی ہے۔

میں نے کرسی سے پشت لگا کر آنکھیں موند لیں۔ تخیل میں دیکھا کہ چراغ کے اندر تیل میں دیا سلائی ایسی بھیگی ہوئی ہے کہ نہ تیل الگ ہے نہ دیا اور سلائی۔ تینوں ایک ہو گئے ہیں۔ اس لمحے تصور میں اپنے محبوب کا چہرہ روشن ہوا اور میرے چہرے پر آسودگی پھیل گئی کہ انہوں نے مجھے ہجر میں وصل کو زندہ رکھنا سکھایا۔

www.ksars.org

عشق—الہامی جذبہ ہے جو فرد کو نفی اثبات اور پھر نفی سکھاتا ہے۔ یہ چراغ میں اس تیل کی مانند ہے جو کسی نفس میں حلول کرتا ہے تو اپنی نفی اور محبوب کا اثبات ہوتا ہے۔ نفی کی شدت بڑھتی ہے، اثبات کا غلبہ ہو جاتا ہے اور پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ ہونا نہ ہونا بے معنی ہو جاتا ہے۔

چراغ—لو—تیل—روشنی اور پروانے—نے مجھ پر وہ راز افشا کئے کہ قلم لکھنے سے قاصر ہے۔

جب تک کوئی اپنی نفی کر کے وصل میں نہیں ڈوبتا، وہ روشن ہونے اور روشن کرنے کی اہلیت سے محروم رہتا ہے۔ روشن ہونے کی دیا سلائی سوزِ جگر ہے۔ لوگ اسے تکلیف سمجھتے ہیں جب کہ میں اسے محبوب کی یاد کے تار — جو مجھے ہر لمحہ خود سے باندھ کر رکھتے ہیں۔ میں بھی یاد میں جلتا ہوں مگر خوش رہتا ہوں کہ محبوب کی جانب سے میرے لئے خوش رہنے کا حکم ہے۔

محبوب نے اپنی محفل میں شامل کیا تو سکھایا،

"یاد رکھیں — شمع پہلے خود جلتی ہے اور جب وہ اپنی زندگی کا اک اک لمحہ آگ میں جلا کر خود کو فنا کر دیتی ہے تو اس ایثار پر پروانے شمع پر نثار ہو جاتے ہیں۔"

www.ksars.org

عرفانہ شہزاد

خط — اللہ کے نام

آج کل شام کو چھت پر چہل قدمی کرتی ہوں۔ سڑکیں سنسان اور راستے خالی ہیں۔ گھر کے پچھلی جانب فارم ہاؤس میں قطار در قطار درختوں کی شاخیں مست و خرم ہوا سے جھولتی ہیں۔ سڑک کے دوسری طرف پارک میں سبز رنگ تازہ گھاس کے تصور سے تلووں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے اور کیاریوں میں رنگین پھول نظر کو تازگی بخشتے ہیں۔

سڑک کنارے دھریک کے درخت سفید اور کاسنی رنگ پھولوں کے گلدستے اٹھائے کھڑے ہیں جن کی بھینی خوش بو سے فضا معطر ہے۔ زمین پر آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان اور آسمان میں وسعت دیکھ کر لگتا ہے کہ فطرت پُر سکون اور آسمان بے نیاز ہے۔ زمین و آسمان کے عجائبات پر غور کرنے والوں کو قدرت آسمانی وسعتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔

نہیں جانتی کہ میرا اور اس کا ساتھ کب سے ہے البتہ یہ معلوم ہے کہ جب میں نہیں تھی — میرا وجود اس کے ارادے میں موجود تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب روحوں کو جسم نہیں ملے تھے۔ جسم ملتے ہی اس کے اور اپنے ہونے کا احساس پیدا ہوا۔ اکثر سوچتی ہوں کہ جب میں نے دنیا میں آنکھ کھولی تو سب سے پہلے کیا دیکھا، پہلا خیال کیا آیا، کس کی آواز سنی اور سب سے پہلے کسے محسوس کیا۔

محسوسات کی دنیا اب تک اس لمحے سے سجی ہوئی ہے جب میں نے اردو لکھنی سیکھی اور مشق کر کے پہلا نام 'اللہ' لکھا۔ ورق پر بابرکت نام لکھتی رہتی مگر دل نہ بھرتا۔ اس نام میں اتنی کشش ہے کہ لکھنے بیٹھتی تو دیر تک لکھتی رہتی۔ یہ محض نام نہیں، بابرکت وجود ہے جس کے دم سے تشخص اور پہچان ہے۔ جب نام لکھنا شروع کیا تو مجھے یقین تھا کہ میں جو بھی ہوں،

www.ksars.org

بس 'اس' کے ہونے سے ہوں۔ 'اللہ' نام سے اتنی انسیت ہوئی کہ اپنا آپ اجنبی ہو گیا۔ آئینے میں دیکھ کر بے یقین رہتی۔ میں آج تک اپنے وجود سے نامانوس ہوں—— ہر دم کچھ نہ کچھ بدل جاتا ہے۔

کڑی دھوپ اور ٹھنڈی چھاؤں میں ہر طرف اس کی مہربانیاں دیکھیں اور محبت علم الیقین سے عین الیقین میں داخل ہو گئی۔ حق الیقین کی مجھے خبر نہیں۔ اتنا جانتی ہوں کہ ہجوم یا تنہائی میں ایک لمحے کو دل احساس سے خالی نہیں ہوا۔ اندر میں کوئی کہتا کہ تم کمزور ہو—— وہ مضبوط ہے۔ اس طرح وہ میرا یقین بن گیا۔

میں اس رشتے پر ناز کرتی اور دل ہی دل میں اس سے باتیں کرنے لگی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھ سے پیار کرتا ہے اور مجھے یاد کرتا ہے۔ بعض اوقات میں چلتے چلتے ٹھہر جاتی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی جیسے دل ابھی سینے سے باہر آجائے گا۔ خمار چھا جاتا اور آنکھوں میں کھل بند شروع ہو جاتی۔ ایسے میں دل چاہتا کہ اس کے سوا پاس کوئی نہ آئے۔

گھر والوں کو خبر نہیں تھی کہ میرا مکان جس جہاں میں ہے، وہ جہاں کوئی اور ہے۔ 'اللہ' نام کی تکرار سے محسوس ہوتا کہ وہ ہر طرف ہے اور مجھے گہری نظر سے دیکھ رہا ہے۔ میں خود کو نگاہِ محبت کے نور میں چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے اور یاد میں مگن دیکھتی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے، سامنے آتا اور چھپ جاتا ہے۔ اس کی محبت نے میرے اندر عجب ناز و انداز پیدا کر دیئے تھے۔

زندگی شعور کے مدارج طے کرتے ہوئے آگے بڑھی اور موجودگی کا احساس قوی ہوتا گیا۔ بچپن کا شعور ذہن میں تھا اس لئے میں جانتی تھی کہ وہ کہی ان کہی سب سنتا ہے اور میرے لکھے بغیر دل کی بات پڑھ لیتا ہے۔ پھر بھی دل چاہتا کہ اسے خط لکھوں۔ شاید یہ میرے محدود شعور کی تسکین تھی۔

میں نے خط لکھنا شروع کئے۔ چپکے چپکے خط لکھتی، پڑھتی اور درسی کتابوں میں چھپا لیتی۔ کبھی الماری میں کپڑوں کے نیچے محفوظ کر لیتی پھر وقت بہ وقت سارے خط نکال کر پڑھتی—— کاغذ بھیگ جاتا تھا، سیاہی پھیل جاتی تھی اور محبت کے سارے رنگ نظر آتے تھے۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ بھیگے ہوئے کاغذ دیکھ کر میں کہتی، اے سیاہی! گواہ رہنا۔

www.ksars.org

خط لکھنے کی تیاری مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب گھر پر کوئی نہ ہوتا تو میں منہ ہاتھ دھو کر امی کی سرخی پاؤڈر لگاتی، آنکھوں میں کاجل سجاتی اور خط لکھنے بیٹھ جاتی۔ ورق آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔ خط لکھنے کے بعد بھیگے کاغذ کو چوم کر ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہتی،

" آپ کے نام"

اور تہ کرکے چھپا لیتی۔ پھر گھر والوں کے آنے سے پہلے منہ دھو لیتی تاکہ کسی کو خبر نہ ہو۔ بیش تر خطوط میں جلا چکی ہوں۔ جو محفوظ ہیں ان میں سے مختصر ترین دو خطوط یہ ہیں۔۔۔

ذہن ہر وقت نامۂ محبت کی طرف متوجہ رہتا۔ سوچتی تھی کہ کاغذ قلم ہاتھ آتے ہی یہ لکھوں گی، وہ لکھوں گی۔ پھر ڈر پیدا ہوتا کہ کوئی پڑھ نہ لے۔ خطوط کی حفاظت مشکل ہو جاتی تو میں شعلوں کے حوالے کر دیتی۔

مجھے یاد ہے جب پہلی مرتبہ دل میں لگی آگ کو فاسفورس سے بنی آگ کے حوالے کیا تو محسوس ہوا کہ کاغذ نہیں جل رہا، میں جل رہی ہوں۔ کاغذ نہیں سلگ رہا، میں سلگ رہی ہوں۔ کاغذ راکھ نہیں ہوا، میں راکھ ہو رہی ہوں۔ آنکھیں جلنے لگیں اور چربی پگھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یکایک جھماکا ہوا۔ کسی نے کہا،

''اطمینان رکھو! محبت کے خطوط جلے نہیں،نگاہِ کرم میں محفوظ ہو گئے ہیں ۔''

اپنائیت کا احساس مزید گہرا ہو گیا۔ سکون اور اطمینان کی لہریں محیط ہو گئیں۔ پھر میں نے خطوط کی حفاظت کرنا چھوڑ دی۔ بس لکھتی اور الماری میں رکھ دیتی۔ بہت عرصے یہ معمول رہا۔ نجانے پھر کیا ہوا کہ میں نے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ یہ عمل ترک کئے سالوں گزر گئے ہیں مگر وہ مجھ سے قریب ہے۔ اس کی تجلی شمع ہے اور میں پروانہ۔

ایک رات خواب میں دیکھا کہ آسمان پر سنہرے رنگ کی بہت بڑی کتاب کھلی ہوئی ہے۔ کتاب نے پورے آسمان کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ میں نیچے کھڑی حیرت سے دیکھ رہی ہوں۔ ذہن میں آواز گونجی،

''یہ وہ خط ہیں جو تم نے ہمیں لکھے تھے ۔''

مجھے باریک کاپی اور رجسٹر کے صفحے یاد آئے۔

www.ksars.org

عرض کیا، میں نے تو آپ کو بہت کم خط لکھے تھے، یہ اتنے زیادہ؟

ہاں! یہ تمہارے خطوط ہیں۔ آواز دوبارہ گونجی۔

میں خوشی سے رونے لگی۔ آنکھ کھلی تو چہرے پر نمی تھی اور دل شکر کے جذبات سے لبریز تھا۔

مجھے یاد ہے ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ ہم سیر و تفریح کے لئے ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے ہر سمت نظر آتا۔ پہاڑوں میں، وادیوں میں چھاجانے والی دھند میں، اوپر، نیچے، ہر طرف۔ اکثر چونک جاتی کہ یہ کیسا دیکھنا ہے کہ میں اسے دیکھ رہی ہوں اور وہ نظر بھی نہیں آتا۔

گھر میں کسی بڑے سے پوچھا، کیا اللہ کو دیکھا جا سکتا ہے ــــ؟ مجھے جھڑک دیا گیا کہ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ آئندہ اس بارے میں سوچنا بھی مت۔ زبان خاموش رہتی لیکن آنکھیں جواب دیتی تھیں کہ وہ محبوب ہی کیا جسے دیکھا نہ جا سکے۔

اسکول میں سہیلی سے کہا، اللہ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔

اس کے چہرے پر تشویش پھیل گئی۔

اس نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔

میں نے پھر کسی سے دل کی بات نہیں کی۔

نویں جماعت میں تھی کہ عجیب خیال آیا۔ بار بار قبر میں لیٹنے کا دل چاہتا تا کہ معلوم ہو کہ ماحول کی تبدیلی حواس پر کیا اثرات مرتب کرتی ہے۔ بظاہر اس خواہش کا پورا ہونا موت سے پہلے ممکن نہیں تھا۔ خیال رد کرنے سے شدت میں اضافہ ہو گیا ۔ میں نے اللہ سے مدد مانگی کہ یا اللہ! کوئی انتظام فرما دے۔

ایک روز صبح کے وقت اسکول جانے کے لئے گیٹ کھولا۔ سڑک کے دوسری طرف تازہ مٹی کا ڈھیر نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا تو تقریباً چھ فٹ گہرا گڑھا تھا۔ غالباً پانی یا سیوریج کی لائن کے لئے کھدائی کی گئی تھی۔ آنکھوں میں چمک آ گئی۔ دل قبر

www.ksars.org

نما گڑھے میں اترنے کے لئے مچلنے لگا لیکن سفید یونیفارم کا خیال آتے ہی خود کو سمجھایا کہ شام ہونے تک صبر کروں۔ کسی نے دیکھ لیا تو پاگل سمجھے گا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ بالآخر شام ہوئی۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ چنبیلی کی خوش بو فضا میں پھیل گئی۔ بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ آج میں نے سفید یونیفارم تبدیل نہیں کیا۔ کسی بہانے سے پہنے رکھا۔ مغرب کے بعد اندھیرا پھیلنا شروع ہوا لیکن اندھیرا ابھی روشنی تھا۔ بچے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ کچھ بچے ابھی تک کھیل رہے تھے۔ میں نے چپکے سے نظر بچا کر گڑھے میں چھلانگ لگا دی اور سیدھا لیٹ گئی۔

مٹی کی نمی محسوس ہوتے ہی کیفیت بدل گئی ــــ گھر کے سامنے سنگ مرمر کی دیوار قریب ہوتے ہوئے بہت دور نظر آئی۔ آس پاس کے گھروں میں بتیاں جلتے بجھتے دیے بن گئیں۔ جھرجھری سی آئی اور ہر چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں اور جسم غیر محسوس ہو گیا۔

اف! کتنا بڑا دھوکا ہے۔ دنیا اور رشتے ناتے، سب کھیل تماشا ہے۔ صرف ایک رشتہ حقیقی ہے اور وہ اللہ ہے۔ حواس اس نقطے میں سمٹ آئے۔ مٹی مٹی میں مل رہی تھی اور جان جان سے لپٹ رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر میں وہاں بے سدھ پڑی رہی۔

امی نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ گلی میں خبر پھیل گئی کہ میں گم ہو گئی ہوں۔ ہر طرف تلاش جاری تھی۔ گلی میں اندھیرے کی وجہ سے کسی کو گڑھے میں دیکھنے کا خیال نہیں آیا۔ کافی دیر بعد ایک بچے نے مجھے دیکھ لیا اور سب کو خبر کی۔ پریشان آوازیں سماعت سے ٹکرائیں اور میں قبر کے ماحول سے نکل آئی۔

دو افراد نے مجھے کھینچ کر باہر نکالا۔ چند گھنٹوں میں رنگ زرد ہو گیا تھا۔ بہت دن تک کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہا۔ بھوک کم ہو گئی لیکن تجربہ اچھا تھا۔ باعث تسکین بات یہ ہے کہ ہر جہاں میں وہ میرے ساتھ ہے، چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

www.ksars.org

اے اللہ ! تو اعلیٰ و بزرگی والا رب ہے

میں نجس و ناپاک بندی

تو قادرِ مطلق ہے

اور میں مجبور محض

تیرے حکم سے میرا وجود ہے

تجھے اپنے محبوب ؐ کا واسطہ

مجھے نورِ محبت سے محروم نہ کرنا

محبت بھرے دن اور محبت بھری شامیں تھیں۔

میں سولہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جاتی اور تنہائی میں ٹہلتے ہوئے باتیں کرتی تھی۔ لگتا تھا کہ خون میں جوش پیدا ہو گیا ہے اور لہروں میں تلاطم برپا ہے۔ اظہار محبت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ سرسراتی ہوائیں کان میں سرگوشیاں کرتی تھیں ۔ جواب موصول ہونے پر طاقت سلب ہو جاتی اور میں زمین پر ڈھیر ہو جاتی۔

گھر والے ڈانٹتے تھے کہ کیا بلاوجہ مسکراتی رہتی ہو۔

میں کسی کو کیا بتاتی ؟

سچ کہتے ہیں کہ گھر کا تبدیل کرنا شعور کا ٹوٹنا ہے۔ میرا شعور بھی بہت مرتبہ ٹوٹا۔ ہم محلے سے سوسائٹی میں منتقل ہو گئے۔ والد صاحب نے قیمتی گھر جہاں میرا بچپن گزرا، سستے داموں فروخت کر دیا!

www.ksars.org

سیڑھیاں، چھت اور وہ کمرا ـــ میرا بستر کھڑکی کے بالکل نزدیک تھا۔ رات میں سوتے ہوئے کھلا آسمان اور چاند آنکھوں کے سامنے ہوتے۔ چاندنی راتوں میں چھت پر ٹہلتے ٹہلتے تھک جاتی تو کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ جاتی۔ پورے چاند کی رات میں روشنی کمرے میں پھیلنے سے ماحول پرُاسرار ہو جاتا۔ میں مسکراتے ہوئے پوچھتی کہ اے چاندنی! کیا تم میری تلاش میں اندر آئی ہو ـــ؟

میں نے سردیوں کی راتوں میں بارہا چاند کی روشنی میں اللہ کے لئے اشعار لکھے جن کے جواب آنکھیں بند کرنے کے بعد موصول ہوتے۔ بچپن کے گھر سے جذباتی وابستگی کی وجہ وہاں میرا گزرا ہوا بچپن نہیں تھا۔ میں اس لئے اداس تھی کہ گھر کے چپے چپے میں یادیں بسی ہوئی تھیں۔ اسے یاد کرنے کی ابتدا اس گھر سے ہوئی تھی۔ فرش پر گرنے والے آنسو بظاہر مٹ چکے تھے مگر مجھے واضح دکھائی دیتے تھے۔ میں اکثر کہتی تھی کہ،

’’ اے فرش ! گواہ رہنا ، یہ آنسو نہیں، میری محبت ، میرا لہو ہے۔‘‘

گھر تبدیل کرنے کا انتہائی دکھ تھا۔ مگر حسرت و یاس اطمینان میں بدل گیا جب بچپن کے گھر میں آخری روز اندر میں آواز گونجی،

’’تم ہماری محبت کو سینے سے لگائے ہماری طرف ہی آرہی ہو ۔‘‘

دل بھر آیا، یااللہ! بے شک میرا سفر آپ سے آپ کی جانب ہے۔ ٹھیک اس روز سے دل گھروں سے آزاد ہو گیا۔ مٹی کی درو دیواریں نہیں، بندے کا اصل گھر دل ہے جہاں محبوب رہتا ہے۔ آج بھی جب گھر سے نکلتی اور داخل ہوتی ہوں تو یہ ضرور کہتی ہوں کہ،

’’ یا اللہ ! آپ مجھ سے رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں ـــ
نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔‘‘

www.ksars.org

عابد محمود

تمنائے وصلِ یار

نقاہت طاری تھی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ میں صحرا یا ویرانے میں نہیں تھا، گھر کے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا سامنے رکھی ہوئی پانی کی بوتل سے پیاس بجھا سکتا تھا لیکن ––– میں کسی کے انتظار میں تھا اور انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ محسوس ہوا کہ اگر کچھ دیر تک پانی نہیں پیا تو پیاس سے مر جاؤں گا۔ خود کو سیرابی سے دور رکھنے کے لئے سامنے رکھے گلاس اور پانی کی بوتل کو نیم وا آنکھوں سے دیکھا ––– نقاہت کے بوجھ سے پلکیں آہستہ آہستہ آنکھوں کی دہلیز پر آ گئیں۔

باغبانی کے دوران بیج کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا کہ چھوٹا سا بیج دلیل ہے کہ اس کی نسل ابتدائے آفرینش سے چل رہی ہے اور یہی چھوٹا بیج اپنی آنے والی نسلوں کا تسلسل ہے۔ بیج نما مائیکرو فلم میں ماضی کا ریکارڈ اور مستقبل کے لاتعداد درخت چھپے ہوئے ہیں۔ میں نے اسے نرم کی گئی مٹی میں رکھا اور اوپر سے مزید مٹی ڈال کر ہلکی سی تھپکی دی۔ سورج کی تمازت سے ماتھے پر بوندیں نمودار ہوئیں اور چہرہ بھگونے لگیں۔ پھر پیاس نے سیرابی کا تقاضا کیا۔

پانی اور پیاس دو رخ ہیں۔ پیاس نظر نہیں آتی، پانی دیکھا جا سکتا ہے۔ دیدہ نادیدہ دونوں رخ ملنے کو بے تاب تھے۔ پیاسے کو لگتا ہے کہ کائنات کی ہر شے پیاسی ہے اور سیرابی چاہتی ہے اور یہی ہر تخلیق کے گردش میں رہنے کی وجہ ہے۔

میرے اندر پیاس نے اپنے دوسرے رخ پانی سے ملنے کے لئے آواز دی۔ میں نے آواز سنی، حلق خشک ہو گیا اور ہونٹوں پر زبان پھیری، پاس پڑی ہوئی بوتل اٹھائی لیکن پانی نہیں پیا بلکہ نرم زمین میں مدفن بیج کی پیاس بجھائی۔

www.ksars.org

میں بڑبڑایا—پانی مٹی کو تروتازہ رکھ کر بیج کی آبیاری کرے گا اور بیج درخت بن جائے گا۔ لیکن پہلے بیج کو خول سے نکلنا ہو گا۔ خول بیج اور مٹی کے درمیان میں دیوار ہے۔ مٹی میں فنا ہونے سے بیج میں سراپا ظاہر ہو گا اور نسل بڑھے گی۔

پودوں کو پانی دے رہا تھا کہ ملازم نے اطلاع دی، صاحب جی! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔ کون ہے—؟

کوئی لڑکا ہے، نام نہیں بتایا، پریشان لگتا ہے۔

ٹھیک ہے۔ مہمان خانے میں بٹھاؤ، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

مہمان خانے میں داخل ہوا تو نیلی قمیص پتلون میں ملبوس ایک لڑکا صوفے پر افسردہ بیٹھا تھا۔ آنکھیں کمرے کی چھت پر نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

چہرہ جانا پہچانا تھا۔ یادداشت پر زور دیا، یاد نہیں آیا۔ وہ میری آمد سے غافل تھا، آنکھیں ہنوز چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ ارتکاز بتا رہا تھا کہ وہ یہاں ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں ہے۔ آنکھوں کے کناروں سے آنسو گالوں پر گرے مگر لڑکے کی محویت قائم رہی۔

گلا کھنکارتے ہوئے اپنی موجودگی سے مطلع کیا تو جیسے وہ ہوش میں آگیا۔ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا، مجھے خبر نہیں ہوئی کہ آپ آگئے ہیں۔

میں نے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے خوش اخلاقی سے جواب دیا، کوئی بات نہیں۔ بتایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟

میرا نام 'قیس' ہے۔ کئی سال پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت میں بارہویں جماعت میں تھا۔ آپ نے سوالوں کا جواب دے کر میری الجھن دور کی تھی۔

www.ksars.org

مجھے یاد آگیا کہ سات سال پہلے ہنستے مسکراتے لاابالی چہرے سے ملاقات ہوئی تھی۔اس چہرے کو موجودہ چہرے میں تلاش کیا۔۔۔کہیں نظر نہیں آیا۔ قیس بدل چکا تھا۔وہ ہنستا مسکراتا چہرہ کہاں چھپ گیا؟ سامنے بیٹھے لڑکے کے چہرے پر داستان چیخ چیخ کر بتا رہی تھی کہ زندگی آگے بڑھ رہی ہے لیکن ذہن ایسے نقطے پر رک گیا ہے جس نے اسے حالات کا قیدی بنا دیا ہے۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، یاد آگیا،آپ سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اس وقت اور آج کے قیس میں بہت فرق ہے۔

الفاظ نے اس کے زخموں کو چھیڑ دیا۔آنکھیں بھر آئیں اور زرد چہرہ سرخ ہو گیا۔ بھاری آواز اور بہتی آنکھوں سے داستانِ محبت سنانی شروع کی۔

آج میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا کیوں کہ میں خود اپنے سوال کی تلاش میں تھا۔

وہ مایوس رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا، قیس! جب تک اپنے سوالوں کے جواب دوسروں سے پوچھو گے، مایوس رہو گے۔اندر تلاش کرو، میں بھی وہاں دیکھ رہا ہوں۔

قیس کے جانے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ محبت کی داستانیں ایک سی ہوتی ہیں۔ وہی محب اور محبوب۔ رقیب اور ظالم رسمیں۔آہیں اور سسکیاں۔ شکوے شکایتیں اور حصولِ یار کی تمنا۔ یہ تمنا دل کو بے چین رکھتی ہے۔نہ جانے وصل کیسا تقاضا ہے جو سب کی زندگی کا جز بن کر نئی نئی داستانیں بن رہا ہے۔

تقاضے کیا ہیں۔۔۔؟

بیج کا مٹی میں ملنے کا تقاضا۔وہ کیوں خود کو فنا کر کے نسلوں کو جنم دینا چاہتا ہے۔۔۔؟

پروانے کے اندر کون سی آگ ہے جو شمع سے مل کر فنا ہونا چاہتی ہے۔۔۔؟

ہر لمحہ کیوں خود کو فنا کر کے نئے لمحے میں داخل ہوتا ہے۔۔۔؟

www.ksars.org

لاعلمی کادوسرارخ علم اور تفکر کادوسرارخ آگہی ہے۔ جاننے کا تقاضاجب ماحول سے بے نیاز کردے تو لاعلمی آگہی سے گلے مل کر علم بن جاتی ہے۔ تقاضے کیاہیں، جاننے کی کوشش کی، ذہن میں ہلکاخاکہ بنالیکن تصویر واضح نہ ہوسکی۔

بالآخرذہن پیاس پر رک گیاکہ پیاس بھی تقاضاہے۔ پیاس خود بتائے کہ وہ کیاہے تو بات بن سکتی ہے۔ میں نے پانی پینا چھوڑ دیااور صبر کی آخری حدتک سیرابی سے دور رہنے کا فیصلہ کیا۔ آٹھ ہزار چھ سوچالیس سیکنڈ (8,640) کے بعد صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگاتو خود کو مصروف رکھنے کے بہانے تلاش کئے۔ حلق خشک، ہونٹ سفید اور آنتیں حسرت ویاس کی تصویر تھیں۔ پیاس کے تقاضے میں شدت تھی۔ میں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا پانی کی بوتل اور گلاس کو نیم واآنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ضبط کامزید امتحان لیتے ہوئے آنکھیں موندلیں۔

شکوک وشبہات پیدا ہوئے کہ شعور زیادہ دیر پیاس کا بوجھ اٹھانہ سکے گا کیوں کہ جسم میں پانی کی کمی جان لیوا ہوسکتی ہے ۔لیکن یہاں تک پہنچ کر پیاس سے ملے بغیر واپس جانادل نے گوارا نہیں کیا۔ اچانک شعور اور لاشعور کے بیچ میں پیاس متشکل ہوکر میرے سامنے آگئی۔ پیاس کی ہیئت اضطرابی کیفیت میں مبتلا، بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ جیسے پروانہ دیوانہ وار آگ دیکھ کر اس میں داخل ہوناچاہتاہے۔

کون ہو تم ــــ؟ نیم واآنکھوں سے پوچھا۔

اس نے کہا، کسی کی چاہت ہوں جو پیاس بن کر تمہارے اندر دور کر رہی ہے۔

کس کی چاہت ــــ؟ مجھے حیرت ہوئی۔

جس کی چاہت یہ کائنات ہے۔ جس نے محبت سے کائنات تخلیق کی تاکہ وہ پہچانا جائے۔

میں جانناچاہتاہوں کہ پیاس کیاہے۔

www.ksars.org

یہی سوال تم سے پوچھتی ہوں کہ تم کیا ہو۔ تمہاری اور میری اصل ایک ہے۔ چوں کہ تم مجھے خود سے الگ دیکھتے ہو اس لئے مجھے پیاس کہتے ہو۔ میں پانی کا باطنی رخ ہوں۔ میرا ہونا پانی کے ہونے کی دلیل ہے۔ ہر شے پانی سے پیدا ہوتی ہے۔ پانی جانتا ہے کہ اس کی اصل کیا ہے۔ چوں کہ وہ روپ بہروپ بن گیا ہے اس لئے پانی کے سارے بہروپ اصل روپ میں ضم ہونا چاہتے ہیں۔ اصل سے وصل کے لئے بے تابی کو تم پیاس کہتے ہو۔

تمہارا مقصد کیا ہے، چاہتی کیا ہو؟ میں نے پوچھا۔

وہی جو محب محبوب سے چاہتا ہے،

جو بیج زمین سے چاہتا ہے،

جو پروانہ شمع سے چاہتا ہے،

جو قطرہ سمندر سے چاہتا ہے

اور وہی جو تم مجھ سے چاہتے ہو۔

میں کوئی اور نہیں تمہاری پیاس کا روپ ہوں۔ مجھے یاد کر کے تم پیاس بن گئے ہو اور میں تمہاری سیرابی ہوں۔ صرف تم نہیں، میں بھی تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں پیاس ہوں اور میرا دوسرا رخ پانی ہے۔ جب تک تم پانی نہیں پی لیتے، میں تمہیں بے چین رکھوں گی۔

میں نے کہا، عجیب بات ہے کہ میں تم میں اور تم مجھ میں فنا ہونا چاہتی ہو تاکہ زندگی کا تسلسل قائم رہے اور پیاس اور پانی مل کر نئے جلوے میں آشکار ہوں۔

وہ بولی، تقاضے کی تسکین سے زندگی کو دوام ہے۔

میں نے کہا، لیکن تم محض پیاس ہو، اصل کام تو پانی کا ہے جو سیراب کرتا ہے۔

www.ksars.org

مسکراتے ہوئے پیاس بولی، پانی میں بھی پیاس ہے۔ ایسا نہ ہو تو پانی کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ تم غور کرو کہ اللہ نے خود کو متعارف کرانا چاہا تو مخلوقات کو محبت سے پیدا کیا۔ چاہنا اور محبت —— دو رخ ہیں جن کے ملنے سے کائنات بنی ہے۔ چاہنا تقاضا ہے اور تقاضے کی تسکین و تکمیل محبت سے ہوتی ہے۔

چاہت —— تقاضا ہے اور تقاضا تحریک ہے جو مجھے تمہیں اور کائنات کو متحرک رکھتا ہے۔ میں بھی زندگی ہوں اور تم بھی زندگی ہو۔ زندگی زندگی سے ملتی ہے۔

قارئین! اس قانون کو سمجھنے کے لئے درج ذیل کرامت اور اس کی تشریح پڑھئے۔

"حالتِ استغراق میں ناناتاج الدینؒ کی آنکھیں کچھ کھلی رہتی تھیں۔ حیات خان اکثر ان کی نیم باز آنکھیں عجیب ذوق و شوق سے دیکھتا۔ ایک مرتبہ استغراق کی حالت میں حیات خان نے مجھے اشارے سے بلایا۔ کہنے لگا، اس پتّے کو دیکھو۔ میری نظر یکے بعد دیگرے کئی پتوں پر گئی۔ جس پتّے کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا اس میں سے ٹانگیں، چہرے کے خدوخال اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں رونما ہو رہی تھیں۔ پتّا تقریباً تین انچ لمبا ہوگا۔ یکایک میری نظر برابر والے پتّے پر جا پڑی۔ اس میں بھی ویسا ہی تغیر ہو رہا تھا۔ یہ دونوں پتّے ایک دوسرے کے پیچھے چلنے لگے۔ ایک دو منٹ میں ان کی ہیئت اتنی بدلی کہ پتوں کی کوئی شباہت ان میں باقی نہیں تھی۔ وہ درخت کے تنے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ اور ناناتاج الدینؒ کی نیم وا آنکھیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔"

کرامت کی علمی توجیہ بیان کرتے ہوئے تاج الاولیا باباتاج الدینؒ نے فرمایا:

"دیکھ یہ درخت ہے۔ اس کے اندر زندگی کے سارے ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں۔ دیکھنا، سننا، سمجھنا، جنبش کرنا، یہ سب ٹکڑے اس درخت کے اندر جھانکنے سے نظر آتے ہیں۔ اس کے ہر پتّے میں سچ مچ کا منہ ہے، سچ مچ کے ہاتھ پیر ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ جب تک پتّا دوسری زندگی سے نہیں ٹکراتا، اس کے اندر عام لوگ یہ نیرنگ نہیں دیکھ سکتے۔ اور جب کوئی پتّا میری زندگی سے گلے ملتا ہے تو جیتا جاگتا کیڑا بن جاتا ہے۔ یہ سمجھ کہ آنکھ سے بھی گلے ملتے ہیں۔ یاد رکھ! زندگی سے زندگی بنتی ہے اور زندگی زندگی میں سماتی ہے۔"

www.ksars.org

پیاس کہہ رہی تھی کہ ایک شے کو دورخ میں دیکھو گے تو سمجھنا ناممکن ہو جائے گا۔ جس کو تم دو پرت سمجھتے ہو، وہ ایک شے کے دو پرت ہیں۔ بیج اور مٹی، محب اور محبوب، شمع اور پروانہ ـــــ دو رخ ہیں جو چاہت کی لڑی میں پروئے گئے ہیں۔ ان کی طرح پیاس اور پانی کا باطن بھی ایک ہے۔ ہر شے گردش میں ہے اور گردش تمنائے وصلِ یار ہے۔

مجھے جواب مل گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر پانی کو دیکھا، گلاس میں ڈالا اور بسم اللہ پڑھ کر ہونٹوں تک لایا،

پانی ـــــ جیسے ہی پیاس سے ملا، دونوں مٹ گئے۔ پانی غائب ہو گیا اور پیاس بھی عارضی طور پر ختم ہو گئی۔ میرے اندر بے نام سیرابی عود آئی جیسے کسی نے فنا ہو کر مجھے زندگی بخش دی ہو۔

www.ksars.org

کمپوزنگ: نسرین منہاس

پروف ریڈنگ: نعیم قریشی

کسارس ٹیم:

وسیم تقی

عمران خان

سلمان انصاری

ممتاز علی ابرو

حماد علی

www.ksars.org